یکم و ۱۶ اکتوبر ۲۰۲۴ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۷ ۔ شمارہ نمبر: ۱۹۔۲۰

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۹۲۔۲۱)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطہء نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

٥ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

یحییٰ سِنوار: مزاحمت کا اِستعارہ

حماس نے تصدیق کی ہے کہ اسرائیل نے غزہ میں اس کے سیاسی اور عسکری رہنما یحییٰ سنوار کو شہید کر دیا ہے۔ اسرائیلی فوج نے جمعرات ۱۷راکتوبر کے روز بتایا کہ سنوار کو شناخت کرلیا گیا ہے وہ ایک روز قبل قتل کیے گئے تھے۔

یحییٰ سنوار کی شہادت پر آنے والے اولین ردعمل میں سے ایک اقوام متحدہ میں ایرانی مشن کا ردعمل تھا۔ ''جب مسلمان شہید سنوار کو میدان جنگ میں استقامت سے کھڑا دیکھتے ہیں، جنگی لباس زیب تن کیے، برسرِ میدان، کسی پناہ گاہ میں نہیں، بلکہ دشمن کا سامنا کرتے ہوئے تو اس طرح مزاحمت کا جذبہ مزید مضبوط اور توانا ہوتا ہے''۔ یہ احساسات مشن نے 'ایکس' پر ایک پوسٹ میں لکھا۔

''الجزیرہ'' کے نمائندے ہانی محمود نے غزہ سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ فلسطینی اس واقعے کو کس طرح دیکھ رہے ہیں۔

''اس واقعے کو کچھ اس طرح دیکھا جا رہا ہے، یہاں تک کہ ان لوگوں کی طرف سے بھی جو سنوار کی حکمت عملیوں کے مخالف تھے، ان کا کہنا ہے کہ وہ ظلم کے خلاف لڑتے ہوئے ایک مجاہد کی موت سے سرفراز ہوئے ہیں۔''

سنوار نے گزشتہ بارہ ماہ کے دوران غزہ میں برسرِ محاذ رہتے ہوئے کارروائیوں میں حصہ لیا، اور اس وقت حماس کی قیادت سنبھالی جب حماس کے سیاسی بیورو کے سربراہ اسماعیل ہنیہ کو اسرائیل نے ایک حملے میں قتل کر دیا تھا۔

سنوار کی قیادت میں، حماس نے غزہ میں اپنی عسکری حیثیت کو برقرار رکھا۔ باوجود اس کے کہ وہ مسلسل اسرائیلی بہیمانہ حملوں کے زد میں رہے، انہوں نے اسرائیلی پوزیشنوں پر حملے بھی کیے اور غزہ کی پٹی میں شہری اور انتظامی امور کو بھی برقرار رکھا۔

سنوار غزہ کی جنگ کے دوران اسرائیلی فوج کا ایک نمایاں ہدف رہے ہیں، لیکن ماضی میں ان کے حوالے سے کیے گئے متعدد دعوے غلط ثابت ہوئے تھے۔

اسرائیلی حکام کا کہنا ہے کہ سنوار ان ماسٹر مائنڈز میں سے ایک تھے جنہوں نے ۷راکتوبر کو اسرائیل پر حماس کے حملے کی منصوبہ بندی کی تھی، ان کے ساتھ محمد ضیف، جو حماس کی عسکری ونگ القسام بریگیڈ کے کمانڈر ہیں، اور مروان عیسیٰ، ضیف کے نائب، شامل تھے۔

فروری میں اسرائیلی فوج نے وہ تصاویر جاری کیں جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا سنوار اپنی بیوی، بچوں اور بھائی ابراہیم کے ساتھ خان یونس میں ایک سرنگ میں دکھائی دیے۔ رپورٹ کے مطابق، یہ تصاویر ۷راکتوبر کے حملے کے چند دن بعد لی گئی تھیں۔ اسی بریفنگ کے دوران، اسرائیلی ترجمان ڈینیئل ہگاری نے دعویٰ کیا کہ اسرائیلی فوج نے سنوار اور حماس کے دیگر رہنماؤں کے بہت سے اہل خانہ کو گرفتار کرلیا ہے اور ان سے تفتیش کی جارہی ہے۔ حقوق انسانی کے اداروں، بشمول اقوام متحدہ، کی متعدد رپورٹیں اسرائیلی تفتیش کاروں کی طرف سے تشدد کو ثابت کرتی ہیں۔ اسرائیلی فوج کے علاوہ، سنوار، ہنیہ اور ضیف کو انٹرنیشنل کریمنل کورٹ (آئی سی سی) کی جانب سے جنگی جرائم کے وارنٹ جاری کرنے کی کوششوں کا بھی سامنا رہا ہے، خاص طور پر ۷راکتوبر ۲۰۲۳ء کے بعد سے، ان سب افراد کو اسرائیلی فوج نے ہلاک ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اب صرف اسرائیلی وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو اور وزیر دفاع یو آف گالانٹ آئی سی سی کے الزامات کی فہرست میں شامل رہنے والوں میں باقی رہ گئے ہیں۔

پناہ گزین کے طور پر پیدا ہوا سنوار، جنہیں ابوابراہیم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، ۱۹۶۲ء میں خان یونس کے ایک پناہ گزین کیمپ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ۱۹۴۸ء کی نکبہ کے دوران صہیونی گروہوں کے حملے کی وجہ سے بے گھر ہوا۔ سنوار کا خاندان فلسطینی گاؤں المجدل سے تھا، جسے تباہ کر کے اس کی جگہ اسرائیلی شہر اشکیلون کی تعمیر کی گئی۔ ۱۹۸۲ء میں سنوار کو اسرائیلی حکام نے پہلی بار ''مزاحمتی سرگرمیوں'' کے الزام میں گرفتار کیا۔ ۱۹۸۵ء میں انہیں دوبارہ گرفتار کیا گیا۔ اپنی دوسری گرفتاری کے دوران، وہ حماس کے بانی شیخ احمد یاسین کے قریب ہوگئے۔ پچیس سال کی عمر میں انہوں نے حماس کی اندرونی سیکورٹی تنظیم ''المجد'' کے قیام میں مدد کی، جس سے انہیں اسرائیل کے ساتھ تعاون کرنے والے فلسطینیوں سے سختی سے نمٹنے کے حوالے سے شہرت ملی۔ ۱۹۸۸ء میں ۲۶ سال کی عمر میں انہیں دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور چار سال قید کی سزا سنائی گئی۔ ان پر دو اسرائیلی فوجیوں کے

اندرونی صفحات پر

- غزہ میں اسرائیلی قتل و غارت کا ایک سال
- فلسطین کا بڑا قیدی
- اسرائیلی جامعات، ظلم میں اسرائیل کی پشتیبان!
- خوراک کے عالمگیر بحران کی باری؟
- سوشل میڈیا نیٹ ورکس: تباہی یا امکانات؟
- انتخابات کا سال: جمہوریت کا امتحان
- بنگلادیش: پراکسی نہیں، فوج

قتل اور ۱۲ رفلسطینیوں کے قتل کی سازش کا الزام تھا۔ انہوں نے ۲۲ سال قید میں گزارے۔

سنوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جیل میں انتہائی منظم زندگی گزاری، جہاں انہوں نے عبرانی زبان کو روانی سے بولنا اور پڑھنا سیکھا اور اپنے ساتھی قیدیوں میں ایک قائد کے طور پر سامنے آئے۔ وہ جیل کے عملے کے ساتھ مذاکرات کا ایک اہم حصہ تھے۔

انہیں ۲۰۱۱ء میں اسرائیل نے ایک قیدیوں کے تبادلے میں رہا کیا جس میں اسرائیلی فوجی گلاد شالیت کے بدلے ایک ہزار سے زائد دیگر فلسطینی قیدیوں کو بھی رہا کیا گیا۔ اس وقت سنوار کو رہا ہونے والوں میں سب سے سینئر اور نمایاں سمجھا جاتا تھا۔

ان کے چھوٹے بھائی محمد سنوار بھی حماس کے ایک مسلح کمانڈر ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے اس حملے کی منصوبہ بندی میں مدد کی جس میں شالیت کو گرفتار کیا گیا تھا۔

۲۰۱۳ء میں وہ غزہ میں حماس کے سیاسی بیورو کے رکن منتخب ہوئے۔ ۲۰۱۷ء میں وہ تحریک کے سربراہ بن گئے۔

۲۰۱۸ء میں سنوار نے اسرائیل کو اشارہ دیا کہ حماس کی حکمت عملی مسلح مزاحمت کے بجائے غیر مسلح جدوجہد کی طرف جا رہی ہے۔ اُس وقت انہوں نے کہا کہ اسرائیل کے ساتھ ایک اور جنگ ''یقینی طور پر ہمارے مفاد میں نہیں''۔

لیکن ۲۰۲۲ء کے آخر تک سنوار کی سوچ میں تبدیلی محسوس ہوئی۔ جب اسرائیل نے اپنی تاریخ کی سب سے دائیں بازو کی حکومت منتخب کی جس نے مسجد اقصیٰ کے حوالے سے اپنے عزائم کا کھل کر اعلان کیا اور سعودی عرب کے ساتھ اسرائیلی تعلقات کی بحالی کے اشارے دیے۔

''سنوار ایک عملی سوچ کے حامل تھے جو حالات کے مطابق سیاسی کوششوں اور عسکری جدوجہد، دونوں پر یقین رکھتے تھے۔ یہ بات یورپی کونسل برائے خارجہ امور کے سینئر پالیسی فیلو ہیولوواٹ نے دسمبر ۲۰۲۳ء میں الجزیرہ کو بتائی۔

۱۴ ردسمبر ۲۰۲۲ء کو سنوار اور دیگر حماس کے رہنماؤں نے غزہ میں ایک بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے اسرائیل میں انتہائی دائیں بازو کی حکومت منتخب ہونے کے بعد یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اب اسرائیل سے کھلی محاذ آرائی متوقع ہے۔ ان کی یہ بات ۲۰۲۳ء میں ٹھیک ثابت ہوئی۔

غزہ میں حماس کی قیادت کرتے ہوئے سنوار نے خطے میں روابط کو مضبوط کرنے پر توجہ مرکوز کی۔ انہوں نے مصر کی قیادت کے ساتھ تعلقات بحال کیے اور شام کی خانہ جنگی پر اختلافات کے بعد ایران کے ساتھ روابط دوبارہ قائم کیے۔

سنوار نے اپنے آپ کو ایک ماہر رہنما ثابت کیا ہے۔ ڈینیل بایمن، سینٹر فار اسٹریٹجک اینڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز کے سینئر فیلو نے الجزیرہ کو بتایا کہ سنوار نے اسرائیل کے لیے سیاسی داؤ ''اور بھی زیادہ'' بڑھا دیے تھے۔ ''یاد رہے کہ ان کی رہائی قیدیوں کے تبادلے کے نتیجے میں عمل میں آئی تھی''۔

تجزیہ کار لووٹ کے مطابق ضیف ۷ ر اکتوبر کے حملے کے حقیقی ماسٹر مائنڈ تھے۔ لیکن سنوار کے برعکس جو اپنی شعلہ بیانی اور عوامی تقریروں سے پہچانے جاتے تھے، ضیف کو کئی سالوں سے عوامی سطح پر نہیں دیکھا گیا۔ اسرائیل کا دعویٰ ہے کہ اس نے ۱۳ رجولائی کے حملے میں ضیف کو ہلاک کر دیا تھا، حالانکہ حماس نے ان کی موت کی تصدیق نہیں کی تھی۔

تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ ہنیہ کے قتل سے قبل، سنوار جنگ بندی اور حماس اور اسرائیل کے درمیان قیدیوں کے تبادلے اور مذاکرات میں کلیدی کردار ادا کر رہے تھے۔

(ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"Spirit of resistance: Hamas leader Yahya Sinwar". ("Aljazeera". October 17, 2024)

مصنوعی ذہانت سے تحریر کردہ خبروں کو سمجھنا مشکل!

جرمنی کی لڈوگ میکسی میلین یونیورسٹی کے سائنسدانوں کی ایک تحقیق میں، صحافیوں کے تحریر کردہ متن اور مصنوعی ذہانت سے تیار کردہ متن فہمی کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے، جس سے اس بات کا تعین ہوا ہے کہ مصنوعی ذہانت سے تحریر کردہ خبروں کو قارئین کے لیے سمجھنا زیادہ مشکل ہے۔

سائنسی جریدے جرنلزم: تھیوری، پریکٹس اور کریٹسزم میں ۲۲ ر اکتوبر کو شائع ہونے والی اس تحقیق میں برطانیہ میں ویب سائٹس پر باقاعدگی سے خبروں کا مطالعہ کرنے والے کم از کم ۳۰۰۰ ر افراد نے حصہ لیا۔

شرکاء نے، نصف مصنوعی ذہانت سے اور نصف صحافیوں کی طرف سے تحریر کردہ ۲۴ متنوں میں سے ہر ایک کا جائزہ لیا۔ اس تحقیق کی سرکردہ مصنفہ سینا تھسلر کوردونوری نے کہا ہے کہ قارئین کو مصنوعی ذہانت کے ساتھ تحریر کردہ خبریں کم سمجھ میں آئی ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ کچھ مصنوعی ذہانت کے متن کو صحافیوں نے درست کیا تھا، لیکن نتیجہ وہی رہا۔

بتایا جاتا ہے کہ مصنوعی ذہانت سے تیار کردہ متن کو سمجھنا زیادہ مشکل ہونے کی ایک وجہ الفاظ کا انتخاب ہے۔

قارئین کو ان عبارتوں میں سمجھنے میں دقت پیش آنے والے الفاظ اور اظہار بیان کا سامنا کرنے سے منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شرکا نے مصنوعی ذہانت سے تیار کردہ متن میں اعداد و شمار اور ڈیٹا کو پیش کیے جانے کے طریقہ کار کو ناپسند کیا ہے۔

دوسری طرف قارئین نے روانی، ساخت اور اسلوب کے لحاظ سے متن کو تسلی بخش پایا ہے۔

اس تحقیقی منصوبے کے سربراہ پروفیسر نیل تھورمین کا کہنا ہے کہ صحافیوں اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کو مصنوعی ذہانت سے معاون متن کو تشکیل دیتے وقت ناقابل فہم الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔

(بحوالہ: ''ٹی آر ٹی نیٹ ڈاٹ اردو''۔ ۳۱ ر اکتوبر ۲۰۲۴ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

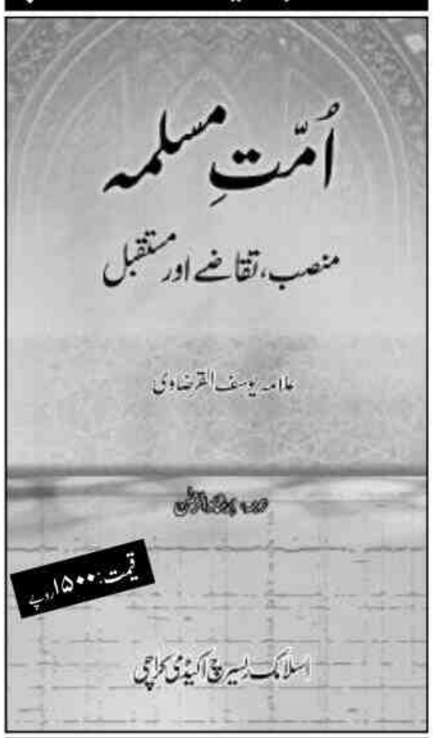

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک-5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

غزہ میں اسرائیلی قتل و غارت کا ایک سال

منصور جعفر

غزہ میں جاری اسرائیلی جنگ کا ایک سال مکمل ہوگیا ہے۔ اسرائیلی جنگ کی صورت غزہ میں گزرنے والے اس سال کا ہرلمحہ غزہ کے باسیوں کے لہو سے رنگا رہا۔

غزہ جنگ نہتے اور زیرمحاصرہ فلسطینیوں کے خلاف طویل ترین جنگ کا ریکارڈ بھی ہے اور اسرائیلی جنگی جرائم کی بدترین مثالوں کا حوالہ بھی۔ یہ جنگ نسل کشی کی جیتی جاگتی اور متحرک مثال بھی ہے اور غیرعلانیہ عالمی جنگ کے پرانے اتحادیوں کی ایک نئی لام بندی بھی۔

غزہ کی پٹی دنیا کا سب سے زیادہ گنجان آباد علاقہ ہے۔ ۳۶۵ مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلی ساحلی پٹی ۲۴ لاکھ افراد کا مسکن ہے، جہاں ایک مربع کلومیٹر رقبے میں ساڑھے پانچ ہزار افراد رہائش پذیر ہیں۔

اسپتالوں کے ایمرجنسی وارڈز اور مردہ خانوں کے ریکارڈ (۷/اکتوبر ۲۰۲۴ء تک) کے مطابق غزہ میں اسرائیلی فوج ۴۱ ہزار ۴۹۵ فلسطینیوں کی جان لے چکی ہے۔ ملبے تلے دبے افراد کی تعداد کا تخمینہ بھی ۱۰/ہزار سے ۲۰ ہزار لگایا جاتا ہے۔

اسرائیل نے غزہ کی محدود جغرافیے کی حامل زیرمحاصرہ گنجان آبادی پر جتنا بارود ایک سال کے دوران پھینکا، اس کی مثال دونوں عالمی جنگوں میں بھی نہیں ملتی ہے۔ اسرائیل غزہ کی چھوٹی سی پٹی پر اب تک ۸۵ ہزار ٹن سے بھی زیادہ بارود بموں کی شکل میں زیرمحاصرہ غزہ کے شہریوں پر برسا چکا ہے۔

آیئے! اب ذرا اس تباہی پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو ایک سال کے دوران اسرائیل نے صرف غزہ کی پٹی کے مختلف علاقوں میں پھیلائی ہے۔

غزہ شہر میں ۳۶ ہزار ۲۷۶ سے زائد مکانات بمباری سے تباہ ہوئے۔ غزہ شہر کے بعد خان یونس میں ۱۸/ہزار ۸۹۰ گھر، دکانیں اور دیگر عمارتیں ملبے کا ڈھیر بنیں۔ خان یونس پناہ گزین کیمپ میں ۳۸۳۶ فلسطینی گھروں اور عمارتوں کو بمباری سے مسمار کیا گیا۔ پولیٹیکل بیورو حماس کے سربراہ یحییٰ سنوار کے آبائی علاقے خان یونس پر کئی مرتبہ بمباری اور شہریوں کو وہاں سے بار بار انخلا کے احکامات دیے گئے۔

رفح شہر پر باضابطہ اسرائیلی حملہ رواں برس سات مئی کو کیا گیا تھا، جو اَب ابھی جاری ہے۔ رفح میں تباہی اور بربادی کے لیے بمباری کے علاوہ ٹینکوں سے گولہ باری کرکے ۱۳/ہزار ۲۳۷ گھروں کو ملبے کا ڈھیر بنایا گیا۔ رفح پناہ گزین کیمپ پر بمباری و گولہ باری سے ۳ ہزار ۸۱۷ مکانات تباہ ہوئے۔

تعلیمی ادارے بھی اسرائیلی بمباری کا ہدف بنے۔ غزہ میں ایک سال سے جاری جنگ نے تقریباً دو تعلیمی سال نگل لیے ہیں۔ تعلیمی انفرااسٹرکچر کا نقصان اس کے علاوہ ہے۔

غزہ کی وزارت تعلیم کے مطابق اب تک ۹۰ فیصد اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بمباری سے تباہ ہوچکی ہیں۔ غزہ کے ساتھ سات اکتوبر ۲۰۲۳ء کے بعد مقبوضہ مغربی کنارے اور مشرقی یروشلم میں بھی اسرائیلی فوج نے تعلیمی اداروں پر حملے کیے ہیں۔ فلسطین کی وزارتِ تعلیم کے مطابق مجموعی طور پر ایسے واقعات کی تعداد ۲ ہزار ۳۵۴ ہے جس سے تعلیمی اداروں کے طلبہ وطالبات اور اساتذہ متاثر ہوئے ہیں۔

اسپتالوں پر اسرائیلی حملے

۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء سے ہی بدترین اور اندھا دھند بمباری کی زَد میں لاکر اسرائیلی فوج جہاں اور سب کچھ جلا چکی تھی، وہیں غزہ کے اسپتال بھی اس کے خاص نشانے پر تھے۔ ’ہیومن رائٹس واچ‘ کی ۱۴/نومبر کو جاری کردہ رپورٹ کے مطابق سات اکتوبر ۲۰۲۳ء سے سات نومبر ۲۰۲۳ء تک اسرائیلی فوج نے غزہ میں قائم انڈونیشیا اسپتال، ترک اسپتال اورالقدس اسپتال کو کئی بار نشانہ بنایا۔ ۳ نومبر کو غزہ کا سب سے بڑا الشفا اسپتال بھی بمباری کی زد پر آگیا۔

ایک رپورٹ کے مطابق سات اکتوبر ۲۰۲۳ء سے ۲۵ جون ۲۰۲۴ء تک اسرائیلی فوج نے ہر روز اوسطاً طبی عملے کے دو ارکان یا ڈاکٹروں کو قتل کیا۔

جون کے اواخر تک تمام فلسطینیوں کے قتل کے حوالے سے یہ تعداد اس طرح تھی کہ ہر ۴۳ فلسطینیوں کے قتل کے ساتھ اسرائیلی فوج کی طرف سے طبی عملے کا ایک رکن قتل کیا جارہا تھا۔

اسرائیلی فوج نے ۲۵ جون تک غزہ کے طبی مراکز پر ۴۶۰ سے زیادہ حملے کرلیے تھے۔ اب تک اسپتالوں اور طبی مراکز پر حملوں کی تعداد ۵۰۵ ہوچکی ہے۔ کم سے کم ۷۵۲ ڈاکٹر و طبی عملے کے ارکان قتل اور ۷۸۲ زخمی ہوئے جبکہ ۱۲۸/زیرحراست ہیں۔

عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) کے مطابق جارحیت کے گیارہویں مہینے کے اختتام تک غزہ کے ۳۶/اسپتالوں میں سے ۱۶/جزوی حد تک کام کرنے کی حالت میں رہے ہیں۔

دوران جنگ مساجد اور کلیساؤں کی تباہی

اقوام متحدہ کے سیٹلائٹ سینٹر کے فراہم کردہ ڈیٹا اور اوپن اسٹریٹ میپ کے جغرافیائی ڈیٹا بیس میں غزہ کی ۶۰ فیصد مساجد کی مکمل تباہی یا جزوی نقصان کی تصدیق ہوتی ہے۔ ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء سے ۳۱ دسمبر ۲۰۲۳ء کے دوران ۱۱۷/مساجد بشمول تاریخی گرینڈ مسجد عمری اور دو گرجا گھر بھی اسرائیلی بمباری سے تباہ ہوئے۔

کھیتوں اور کھلیانوں کی بربادی

اقوام متحدہ کی ۲۷/اگست کو جاری کردہ سیٹلائٹ امیج رپورٹ میں غزہ کے زرعی فارم ہاؤسز کی تباہی کا منظر دیکھا جاسکتا ہے۔ غزہ کے کُل قابل کاشت رقبے کا ۶۸ فیصد حصہ (۱۰۲/مربع کلومیٹر) اسرائیلی بمباری اور فوجی نقل وحرکت سے تباہ ہو چکا ہے۔ شمالی غزہ کی ۷۸ فیصد زرعی زمین جبکہ رفح میں ۵۷ فیصد زرعی رقبہ ناقابل استعمال ہو چکا ہے۔

سڑکوں کی بربادی

اسرائیلی بمباری سے غزہ میں سڑکوں کا ۶۸ فیصد (۱۱۹۰/کلومیٹر) نیٹ ورک تباہ ہوگیا ہے۔ اقوام متحدہ کے سیٹلائٹ سینٹر کی جانب سے ۱۸/اگست ۲۰۲۴ء کو جاری کردہ ابتدائی ڈیٹا رپورٹ کے مطابق غزہ میں تباہ ہونے والی شاہراؤں میں ۴۱۵ کلومیٹر سڑکیں مکمل تباہ جبکہ ۱۴۴۰/کلومیٹر پر محیط سڑکیں جزوی طور پر تباہ ہوئی ہیں۔

اجتماعی قبریں

اسپتالوں کے محاصروں اور حملوں کے دوران اسرائیلی فوج ۵۲۰ فلسطینیوں کو ۱۳۰/اجتماعی قبروں میں پھینک چکی ہے۔

قتل ہونے والے صحافی

اسرائیل۔غزہ جنگ کے دوران ۱۷۳/صحافی بھی اسرائیلی فوج کی بمباری، ڈرون حملوں اور فائرنگ کا نشانہ بن کر زندگی سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ ۸۰ زخمی صحافیوں کی تعداد (اب تک) اس کے علاوہ ہے۔ دو صحافیوں کو اسرائیلی فوج غزہ سے گرفتار کرکے ساتھ لے گئی۔

گوتریس کی بےبسی

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتریس کہتے ہیں کہ ’غزہ کو درپیش ابتلا کی درجہ بندی ایک مشکل امر ہے۔ عالمی ادارے کی ذمہ داری سنبھالنے سے لے کر میں نے آج تک اس درجے کی عدیم المثال تباہی نہیں دیکھی‘۔

(بحوالہ: ’’انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام‘‘۔ ۷/اکتوبر ۲۰۲۴ء)

فَلسطین کا بڑا قیدی

تیسرا اور آخری حصّہ

Nicolas Pelham

محمود عباس کی نگرانی میں قائم فلسطینی اتھارٹی نے عرب دنیا کی آلام زدہ ریاستوں جیسا دکھائی دینا شروع کردیا۔ جاپان کی دی ہوئی امدادی رقم نے فلسطینی اتھارٹی کے صدر دفاتر کا کمپاؤنڈ تعمیر کرنے میں معاونت کی۔ اس کمپاؤنڈ کے اندر محمود عباس کے کم و بیش ۲۸۰۰ گارڈز کے لیے بیرکس کے علاوہ ایک ہیلی پیڈ بھی تھا۔ محمود عباس نے اپنے لیے ایک جیٹ طیارہ بھی مانگا تھا مگر چونکہ اُن کے زیرِ تصرف علاقے میں کوئی ہوائی پٹی نہیں تھی، اس لیے انہیں اپنا جیٹ اُردن کے دارالحکومت عمان میں رکھنا پڑا۔

محمود عباس پر کبھی کرپشن کا الزام عائد نہیں کیا گیا، جیسا کہ عرب دنیا کے بیشتر لیڈرز کے معاملات میں ہوتا ہے، تاہم پناہ گزین کیمپوں میں پڑے ہوئے فلسطینیوں کی نظر میں محمود عباس کی زندگی بہت مختلف تھی اور انہیں زندگی کی سختیاں جھیلنی نہیں پڑی تھیں۔ رام اللہ میں ایک فلسطینی صحافی نے کہا کہ ہم نے انہیں بہت کم دیکھا ہے ایسا لگتا ہے جیسے انہیں مروان برغوثی کے ساتھ جیل میں بند کردیا گیا ہو۔

مروان برغوثی نے فتح گروپ کی کرپشن کے خلاف ہر دور میں آواز اٹھائی۔ یاسر عرفات کے انتقال کے بعد مروان نے دو بار فلسطینی اتھارٹی کے انتخابات میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے حصہ لینے کا سوچا مگر اُن پر قریبی حلقوں نے زور دیا کہ وہ فتح سے اپنا تعلق ختم نہ کریں۔

۲۰۰۶ء میں دیگر بلاکس یا دھڑوں کے ساتھ کام کرنے کی مروان برغوثی کی صلاحیت کی ضرورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس سال فلسطینیوں کو اپنی مرضی کی حکومت منتخب کرنے کا دوسرا موقع ملا۔ فلسطینیوں نے حماس کو بھاری اکثریت سے کامیاب کروایا۔ یہ دیکھ کر ایک دنیا حیران رہ گئی۔ محمود عباس کسی بھی طور اس بات کے خواہش مند نہ تھے کہ اسلام نواز افراد کو حکومت کا حصہ بنائیں مگر خیر، انتخابی نتیجہ اس قدر واضح تھا کہ اُسے نظر انداز کرنا کسی بھی اعتبار سے ممکن نہ تھا اور ایسا کرنا جمہوریت کی موت سمجھا جاتا۔

مروان برغوثی کو پیچیدہ صورتحال کا توڑ تلاش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ تب وہ ھدرم نامی جیل میں تھے جو فلسطینی سیاسی اشرافیہ کو مقید رکھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس جیل کے مرکزی بلاک میں ۸۰ قیدی تھے جن میں فتح اور حماس دونوں ہی کی نمائندگی تھی۔ انہی میں یحییٰ سنوار بھی شامل تھے۔ یحییٰ سنوار ہی نے ۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کی منصوبہ سازی کی تھی۔ حماس کے نمائندوں کے ساتھ مل کر مروان برغوثی نے ایک ایسا پروگرام تیار کیا جس کا بنیادی مقصد دونوں دھڑوں کے درمیان تصفیے اور ہم آہنگی کی راہ ہموار کرنا تھا۔ اسرائیلی سیاست دان بھی جیل میں فلسطینی قیدیوں سے ملنے آتے رہتے تھے۔ انہیں فلسطینیوں کے دونوں بڑے سیاسی دھڑوں کے درمیان ہم آہنگی کی کوششوں کے بارے میں بتایا جاسکتا تھا اور یوں اسرائیلی قیادت کا متوقع ردِعمل بھی معلوم کیا جاسکتا تھا۔

مئی ۲۰۰۶ء میں فتح گروپ نے ایک بیان جاری کیا جسے بعد میں قیدیوں کی دستاویز کہا گیا۔ اس میں قومی یکجہتی کی ایسی حکومت کے قیام کی کال دی گئی جس کا مقصد گرین لائن سے آگے مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کے خلاف مزاحمت کرنا ہو۔ اس دستاویز میں ایک فلسطینی ریاست کے آئینی خطوط بھی وضع کیے گئے۔ اس میں سب کے لیے یکساں حقوق کی بات کی گئی تھی۔ خواتین کو برابری کا درجہ دینے کی یقینی دہانی کرائی گئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ فلسطینی اگر اپنے علاقوں کی حدود قبول کریں گے تو بس وہ جو ۱۹۶۷ء سے پہلے تھیں۔ مروان برغوثی کی کوششوں اور حوصلہ افزائی سے حماس بظاہر دو ریاستی حل قبول کرنے پر آمادہ نظر آئی۔

محمود عباس حماس کی انتخابی فتح کے نتیجے میں بہت پریشان تھے اور کسی نہ کسی طور فلسطینی اتھارٹی کو دوبارہ قائم کرنے کی کوششوں میں جُتے ہوئے تھے۔ انہوں نے قیدیوں کی دستاویز کے پہلے قدم کو قبول کیا اور قومی یکجہتی کی حکومت کے قیام پر رضامندی ظاہر کی۔ یہ حکومت حماس، فتح گروپ اور چند آزاد امیدواروں پر مشتمل ہونی تھی۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے لیے کام کرنے والے ماہرِ معاشیات سلام فیاض کو اس قومی حکومت میں وزیرِ خزانہ مقرر کیا جانا تھا۔

خیر، وہ لوگ موجود تھے جو حماس کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ امریکا نے فتح گروپ سے تعلق رکھنے والے غزہ کے ایک جنگجو سردار کو نئی فلسطینی اتھارٹی بریگیڈ تیار کرنے میں مدد کی جس کا بنیادی مقصد اسلام نواز سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کو کچلنا تھا۔ جب حملے ہوئے تو حماس کے کارکنوں نے بھرپور جوابی حملے کیے، جس کے نتیجے میں محمود عباس کی سپاہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ یوں قومی اتفاقِ رائے کی حکومت زمین بوس ہوگئی۔

اپنے اختیارات بحال کرنے کی کوشش میں محمود عباس بدحواس ہوگئے۔ رائے عامہ کے جائزوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ان کی مقبولیت کا گراف تیزی سے گر رہا ہے۔ مروان برغوثی کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ محمود عباس کے اتحادیوں کے لیے یہ بات بہت حد تک ایسی نہ تھی کہ ہضم ہو پاتی۔ پھر بھی ان کے پاس مروان برغوثی کو سراہنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ زبانی طور پر ہی سہی، وہ مروان کے حامی و حمایتی دکھائی دیے اور محض زبانی جمع خرچ کے نام پر اُن کے ہیروازم کو سراہتے رہے۔ محمود عباس کے ایک اتحادی کا کہنا تھا کہ اس بات کی گنجائش برائے نام بھی نہ تھی کہ کوئی مروان برغوثی کے خلاف بولتا۔

۷/اکتوبر ۲۰۲۳ء کو حماس اور دیگر گروپوں نے جنوبی اسرائیل اور غزہ کو الگ کرنے والے سیکورٹی بیریئر کی خلاف ورزی کی، اُن کے جاں بازوں نے اسرائیل کی حدود میں واقع قصبوں پر دھاوا بولا، ایک میوزک فیسٹیول کے شرکا کو نشانہ بنایا، ایک ہزار سے زائد افراد کو قتل کیا۔ اسرائیلی ریاست کے لیے یہ اب تک سب سے خونیں دن تھا۔

اسرائیلی فوج نے ایسی سفاکی سے جوابی وار کیے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اسرائیلی جیل میں موجود فلسطینی قیدیوں پر بھی قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ فروری میں رہائی پانے والے ایک قیدی نے بتایا کہ ایک جیل میں ہر کھانے سے پہلے قیدیوں کو برہنہ کرکے گھٹنوں کے بل جھک کر اسرائیلی پرچم کو چومنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ یہ ایسا سلوک تھا جس کے آگے عراق کی ابو غریب جیل میں امریکی فوجیوں کی مسلم قیدیوں سے بدسلوکی پکنک جیسی دکھائی دینے لگی یعنی ایسا گندا سلوک تو کبھی وہاں بھی روا نہیں رکھا گیا۔ اطلاعات ہیں کہ ان مظالم کے باعث اسرائیلی جیلوں میں ۱۰ فلسطینی قیدی جاں بحق ہوگئے۔

مروان برغوثی کے وکیل نے بتایا کہ انہیں قید تنہائی میں ڈال دیا گیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہاں مکمل تاریکی رکھی جاتی تھی۔

انہیں پورے والیوم کے ساتھ اسرائیل کا قومی ترانہ دن بھر سنایا جاتا تھا۔ ان کی کتابیں، ٹی وی سیٹ اور اخبارات ضبط کرلیے گئے۔ کھانا اور پانی حساب کتاب سے دیا جانے لگا۔ اس کے نتیجے میں اُن کا وزن ۱۰ کلوگرام کم ہوگیا۔ اسرائیلی پریس نے بتایا کہ اسرائیل کے انتہائی دائیں بازو کے وزیرِ سلامتی اِتمار

بین گورِ نے جیل کے ایک گارڈ کو اس لیے معطل کر دیا کہ اس نے مروان برغوثی کو زیادہ کھانا دیا تھا۔ اسرائیلی اتھارٹیز کا دعویٰ تھا کہ مروان برغوثی اور دیگر قیدیوں سے جو سلوک روا رکھا گیا، وہ متعلقہ قوائد وضوابط کے مطابق تھا۔ مروان کی اہلیہ فدوہ نے، جو اُن کی ترجمان بھی ہیں، صحافیوں سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ میں کچھ کہہ کر کسی کو مشتعل نہیں کرنا چاہتی، مروان کو مزید خطرات سے دوچار نہیں کرنا چاہتی۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب سے غزہ پر اسرائیلی حملے شروع ہوئے ہیں، میں مروان کی سلامتی کے حوالے سے بہت فکرمند ہوں۔

چند ہفتوں کے دوران غزہ میں پھنسے ہوئے اسرائیلی یرغمالیوں کی رہائی کے لیے اُن کے اہلِ خانہ نے اپنی مہم تیز کر دی ہے اور اسرائیلی حکومت پر دباؤ بڑھا دیا ہے۔ بہت سے یرغمالیوں کے اہلِ خانہ نے تو اسرائیلی وزیرِ اعظم بنیامین نیتن یاہو کے گھر کے باہر بھی احتجاج کیا ہے۔ ایک طرف تو اسرائیلی اتھارٹیز مروان برغوثی سے ناروا سلوک کر رہی ہیں اور دوسری طرف اُنہیں یہ بھی اندازہ ہے کہ مروان کی رہائی اُن کے لیے کس طرح کے اثرات کی حامل ہوگی۔

اسرائیل کے سابق وزیرِ انصاف شتریت کو اس بات کا یقین ہے کہ مروان برغوثی کی رہائی اسرائیل کے مفاد میں ہوگی۔ ان کا کہنا تھا اگر میرے بس میں ہوتا تو اب تک اُنہیں رہا کر چکا ہوتا کیونکہ اس صورت وہ خطے میں امن کی راہ ہموار کرتے اور ایک ایسی فلسطینی ریاست کے قیام کی طرف بھی بڑھتے جو اسرائیل کا بُرا نہ چاہتی ہو۔

ابوفرح اپنا ذہن بنانے یعنی کسی مستحکم نتیجے اور فیصلے تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مروان ذہین بھی ہیں اور چالاک بھی، اس لیے وہ بہت اچھے لیڈر ثابت ہوں گے۔ اور یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ہم ایسے لیڈر کے ذریعے حقیقی امن واستحکام یقینی بنانے میں واقعی کامیاب ہوسکتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اُن پر مکمل بھروسا نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کسی ایسے شخص کو فلسطینی عوام کا صدر کیونکر منتخب کر سکتے ہیں جو دہشت گرد رہا ہو۔

فدوہ کا کہنا ہے کہ اُن کے شوہر اب بھی دو ریاستی حل کے حامی ہیں۔ اور یہ حقیقت اُن اسرائیلیوں کے لیے بہت پریشان کن ہے جو انہیں مسترد کرنا چاہتے ہیں۔ فدوہ کہتی ہیں اسرائیلی لیڈر کسی ایسے فلسطینی لیڈر کو قبول کریں گے جو کہتا ہو کہ میں اسرائیل کو دیکھنا نہیں چاہتا۔

اب سوال یہ ہے کہ فلسطینی ریاست کا وجود یقینی بنانے کے لیے مروان برغوثی کیا کرنا چاہیں گے۔ اس معاملے میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ چند فلسطینی صحافیوں کا کہنا ہے کہ مروان برغوثی اب ایسی مزاحمت پر یقین رکھتے ہیں جس میں تشدد کا عنصر غالب نہ ہو۔ دوسری طرف ان کی رہائی کی مہم چلانے والے احمد غنیم سمیت بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ بعض معاملات میں ایک خاص حد تک تشدد لازم ہوتا ہے۔ یہ رائے اس لیے ہے کہ فلسطینیوں کو طاقت کا سامنا ہے۔ جب عسکری قوت بروئے کار لائی جائے گی تو عسکریت پسندی بھی پروان چڑھے گی۔

ایک مغربی سفارت کار نے مروان برغوثی سے پیغامات کے تبادلے کے بعد بتایا ہے کہ مروان اب بہت حد تک تشدد ترک کرنے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً وہ اس بات کے حق میں ہیں کہ مقبوضہ علاقوں سے آگے کہیں بھی خواتین اور بچوں کو نشانہ نہ بنایا جائے۔

یہ تو واضح ہے کہ محمود عباس فلسطینی ریاست کے قیام کے حوالے سے تحمل پسند ہیں تاہم مروان برغوثی زیادہ صبر کرنے کے قائل نہیں۔ جیل کے اندر بھی انہوں نے اس حوالے سے سوچا اور لکھا ہے۔ ان کے مسودوں سے ان کے ارادوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ اب تشدد پر زیادہ یقین نہیں رکھتے مگر سول نافرمانی کو ہتھیار کے طور پر بروئے کار لانے کو ضرور اہم گردانتے ہیں۔

مروان نے یہ منصوبہ بھی تیار کیا ہے کہ غیر مسلح فلسطینی پُرامن احتجاج کرتے ہوئے مقبوضہ بیت المقدس میں، غرب اردن میں یہودی بستیوں کے باہر اور اسرائیلی فوج کی چوکیوں کے گرد جمع ہوں۔ جوان اور معمر افراد فرنٹ لائن میں ہونے چاہئیں۔ اس منصوبے کے تحت قبضے کے بنیادی ڈھانچے (دیواروں، سڑکوں پر رکاوٹوں، چیک پوائنٹس اور برقی تنصیبات) کو تباہ کیا جانا چاہیے۔ یہ تو سیدھی سی بات ہے کہ جب ایسا ہوگا تو اسرائیلی فوج فائر کھولے گی۔ احمد غنیم کہتے ہیں آزادی مفت نہیں ملتی اور محمود عباس کو اس کے لیے ادا کی جانے والی قیمت سے ڈر لگتا ہے۔

غزہ اور مقبوضہ غرب اردن کے باشندوں کے لیے ایک سال انتہائی مصیبتوں کا زمانہ رہا ہے۔ اسرائیلی فوج نے ایک سال کے دوران غزہ کے شہروں اور قصبوں کو تباہ کر دیا ہے۔ دوسری طرف یہودی آبادکار بھی تشدد پر اتر آئے ہیں۔ غربِ اردن میں بھی ۵۰۰ سے زیادہ فلسطینی شہید کیے جاچکے ہیں۔ کوبر میں اسرائیلی فوجیوں نے حال ہی میں مروان برغوثی کے پوسٹر اکھاڑ پھینکے ہیں۔ جنوری میں جب ایک بڑے اسرائیلی انٹیلی جنس افسر نے مروان کے بھائی موکبل سے ملاقات کی تو اُس کا رویہ بہت دوستانہ تھا۔ اس ملاقات کے خاتمے پر اسرائیلی انٹیلی جنس افسر نے موکبل کو سلیوٹ کیا تھا اور کہا تھا کہ تم مستقبل کے فلسطینی لیڈر کے بھائی ہو۔

رام اللہ میں محمود عباس کے حامی یہ سوچ کر پریشان ہیں کہ اگر مروان برغوثی جیل سے چُھوٹے تو محمود عباس کا کیا ہوگا۔ اگر لوگ مروان کی رہائی کا جشن مناتے ہوئے محمود عباس کے کمپاؤنڈ تک پہنچے تو کیا ہوگا۔ فتح گروپ کے سیکورٹی چیف کا کہنا ہے کہ اس کے نتیجے میں فلسطینیوں کے درمیان خانہ جنگ چھڑ سکتی ہے۔

محمود عباس کے ایک قریبی معاون کا کہنا ہے کہ مروان برغوثی کو فلسطینی اتھارٹی میں بہت اہم کردار سونپا جاسکتا ہے۔ محمود عباس اس بات کے لیے زیادہ پرجوش دکھائی نہیں دیتے کہ مروان کو جیل سے جلد نکالا جائے۔ اسرائیلی یرغمالیوں کے عوض فلسطینی قیدیوں کی رہائی سے متعلق مذاکرات کے بارے میں معلومات رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ محمود عباس نے قطر کے ثالثوں پر زور دیا ہے کہ وہ رہائی پانے والے متوقع قیدیوں کی فہرست سے مروان برغوثی کا نام نکال دیں۔

یہی سبب ہے کہ حماس مروان کی جلد رہائی چاہتی ہے۔ وہ جنگ کے بعد کے فلسطین میں اپنی بقا کے لیے مروان کو بہت اہم سمجھتی ہے۔ مغربی سفارت کاروں کا خیال ہے کہ مروان اسرائیلی ریاست کو تسلیم کراکے حماس کو قومی یکجہتی کی حکومت کا حصہ بنانے میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ابھی یہ واضح نہیں کہ مروان جب جیل سے باہر آئیں گے تو ان میں لوگوں کو کیسی تبدیلیاں دکھائی دیں گی۔ نیلسن مینڈیلا جب رہا ہوئے تھے تو دنیا نے دیکھا تھا کہ ان میں غیر معمولی دانائی پیدا ہوگئی تھی۔ ان کی سوچ مدبرانہ تھی۔ کیا مروان میں بھی ایسی کوئی بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے، یہ بات کوئی بھی ابھی پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ۲۰۱۶ء کے بعد ان سے بہت کم لوگ ملے ہیں۔ ایک سال سے تو اُن کی اہلیہ بھی اُن سے نہیں مل پائی۔ اسرائیل کے پریزن انٹیلی جنس افسر بٹن کا کہنا ہے کہ اس نے جیل میں جس مروان کو دیکھا وہ اس لیڈر سے کم متاثر کن ہے جو فلسطینیوں کے دلوں میں رہتا ہے۔ یحییٰ سنوار کو لوگوں نے قیدیوں کے ساتھ زیادہ گھلتے ملتے دیکھا ہے۔ قیدیوں پر مروان کے اثرات خاصے محدود رہے ہیں۔

///// باقی صفحہ نمبر ۱۴ \\\\\

اسرائیلی جامعات، ظلم میں اسرائیل کی پُشتیبان!

Somdeep Sen

سیاست کو تعلیمی اداروں سے باہر ہونا چاہیے۔ یہ وہ بیانیہ ہے جو مغرب کے اکثر تعلیمی ادارے، اساتذہ اور ان طلبہ کو باور کراتے ہیں جو اسرائیلی تعلیمی اداروں کے بائیکاٹ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان طلبہ اور اساتذہ کا کہنا ہے کہ اسرائیل کئی دہائیوں سے فلسطینی علاقوں پر قابض ہے اور فلسطینی عوام کو ظلم وستم کا نشانہ بنا رہا ہے۔ اسرائیل غزہ میں جاری جنگ کے ذریعے فلسطینیوں کی نسل کشی کرنا چاہتا ہے۔

وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جامعات سماجی مکالمے، اظہار بیان کی آزادی اور آزادانہ تحقیق کا مرکز ہوتی ہیں۔ ان اداروں کے علمی سطح پر بائیکاٹ کا کوئی بھی ادارہ جو سیاسی حوالوں سے غیر جانبدار ہو، متحمل نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً اسرائیل اور فلسطین کے تنازع کے پس منظر میں۔

مزید یہ کہ بہت سے لوگ واضح طور پر اسرائیل کی ریاستی جرائم میں شمولیت سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حکومت کے جنگی جرائم اور بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزیوں کی وجہ سے تعلیمی اداروں کو سزا دینا غیر منصفانہ ہے۔

اس پر یقیناً تنقید کی جاسکتی ہے کہ ایک ایسے موقع پر جب انسانی المیہ عروج پر ہو، جس ظلم و جبر کو عالمی عدالت انسانی نسل کشی سے تعبیر کر چکی ہو، یہ کہنا کہ تعلیمی اداروں کو غیر جانبدار رہنا چاہیے، منطقی حقائق کے برخلاف ہے۔ اس وقت چالیس ہزار سے زائد فلسطینی جاں بحق ہو چکے ہیں، ہزاروں افراد لاپتا ہیں۔ غزہ کی جامعات اسرائیلی بمباری سے ملبے کا ڈھیر بن چکی ہیں اور یہ جنگ ختم ہوتی بھی نظر نہیں آرہی۔ اس پوری صورتحال میں اسرائیلی تعلیمی ادارے جو اس جرم میں برابر کے شریک ہیں، ان کا محاسبہ بھی ہونا چاہیے۔

اسرائیلی جامعات نے کئی دہائیوں سے فلسطینیوں کے حق میں بولنے والوں اور اسرائیل کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھانے والوں کے خلاف سنسرشپ کو ایک ہتھیار کے طور پر منظم طریقے سے استعمال کیا ہے، خاص طور پر ۷/اکتوبر حماس کے حملے کے بعد اس عمل میں شدت آئی ہے۔

حال ہی میں پروفیسر نادرہ شلحوب کیورکیان جو یروشلم کی ہیبرو یونیورسٹی (HUJI) سے وابستہ ہیں اس سال اپریل کے وسط میں انہیں صہیونیت پر تنقید کرنے اور غزہ میں جاری اسرائیلی نسل کشی کی مخالفت کے سبب اسرائیلی پولیس نے گرفتار کیا۔ کیوورکیان کی گرفتاری سے کئی ماہ پہلے ان کے خلاف ایک مہم چلائی جارہی تھی جس کا مقصد ان کے الفاظ اور تحریروں کو اسرائیل کے خلاف ''تشدد کی ترغیب'' کے طور پر پیش کرنا تھا۔ اگرچہ یہ مہم اسرائیلی حکام اور میڈیا کے ذریعے چلائی جارہی تھی لیکن ممکنہ طور پر اس میں ان کی جامعہ بھی شامل تھی۔

گزشتہ سال اکتوبر کے آخر میں، ہیبر یو یونیورسٹی یروشلم (HUJI) کی قیادت نے کیوورکیان کو ایک خط بھیجا جس میں ان کی جانب سے غزہ میں فوری جنگ بندی اور اسرائیل۔فلسطین تنازع کے سیاسی حل کے لیے ایک پٹیشن پر دستخط کرنے کے فیصلے پر ''حیرت، نفرت اور شدید مایوسی'' کا اظہار کیا گیا تھا۔ خط میں کہا گیا کہ یونیورسٹی کے صدر اور ریکٹر اس بات پر شرمندہ ہیں کہ یونیورسٹی کے عملے میں کیوورکیان جیسی شخصیات شامل ہیں۔ انہیں اپنی ملازمت چھوڑنے پر غور کرنا چاہیے۔ جامعہ کے حکام نے اس خط کی تشہیر کی اور ان کے خلاف فضا کو سازگار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

مارچ میں جب شلحوب کیورکیان نے ایک ٹی وی انٹرویو کے دوران صہیونیت کے خاتمے کا مطالبہ کیا تو جامعہ کے حکام نے انہیں معطلی کا خط بھیجا جس میں انہیں ملکی اور عالمی سطح پر ملک کے لیے باعث شرمندگی قرار دیا گیا۔ اس میں مزید کہا گیا کہ ہیبرو یونیورسٹی یروشلم (HUJI) ایک ''عظیم الشان اسرائیلی، عوامی اور صہیونی ادارہ'' ہے۔ یہ خط ایک بار پھر عام کیا گیا اور یہاں تک کہ کچھ اراکینِ کنیسٹ کو بھی براہ راست بھیجا گیا۔ شلحوب کیورکیان نے کہا کہ اس خط نے ان کے خلاف اشتعال انگیزی کو ہوا دی اور اس طرح ان کی اور ان کے خاندان کی زندگی کے لیے مشکلات اور خطرات بڑھ گئے ہیں۔

عام طور پر فلسطین کی حمایت میں آواز اٹھانے والوں کو خاموش کرنے، ان کی ذاتی معلومات افشا کرنے اور تادیبی کارروائیوں کا نشانہ بنانا اسرائیلی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ ۷/اکتوبر کے بعد سے، اسرائیلی جامعات میں زیرِ تعلیم فلسطینی طلبا کے گھروں کے پتے اور تصاویر سوشل میڈیا پر شیئر کی جارہی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کی کونسل نے اسرائیلی جامعات اور کالجوں کو یہ بھی ہدایت دی ہے کہ وہ ان تمام شکایات کی تحقیقات کریں جو ان طلبا اور اساتذہ کے خلاف درج کی جاتی ہیں، جو عوامی طور پر ایسی تنظیموں جیسے حماس اور فلسطینی اسلامی جہاد کے لیے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح فلسطین کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کی ہر صورت کو اسرائیلیوں کے خلاف تشدد کی ترغیب کے طور پر سمجھا اور برتا جاتا ہے۔

اسرائیل کے ناقدین کو خاموش کرنے کے ساتھ ان جامعات نے غزہ میں اسرائیل کی فوجی مہم کے دوران اس کے لیے عالمی حمایت کو فروغ دینے میں فعال کردار ادا کیا ہے۔ ۷/اکتوبر کے بعد کے ابتدائی دنوں میں، تل ابیب یونیورسٹی (TAU) کے صدر نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ TAU ''ملکی سطح پر کی جانے والی کوششوں کی حمایت کے لیے اپنی تمام تر قوت اور صلاحیتوں کو بروئے کار لائی ہے''۔ ان افراد پر تنقید بھی کی گئی جو اسرائیلی تعلیمی اداروں کے بائیکاٹ کا مطالبہ کر رہے تھے اور ''غیر ملکی تعلیمی اداروں کے کچھ رہنماؤں'' پر بھی تنقید کی جو بائیکاٹ، پابندیوں کی مہمات کو روکنے میں ناکام رہے تھے۔ اس پس منظر میں، TAU یونیورسٹی کے ترجمان کا کہنا تھا کہ ''انہوں نے اپنی کوششوں میں میڈیا تک رسائی'' کو شامل کیا ہے اور طلبہ کی خدمات کو حاصل کیا جارہا ہے تاکہ وہ ''سوشل نیٹ ورکس پر فعال ہوں'' اور ان شرپسندوں کو بے نقاب کیا جاسکے جو معصوم اور بے خبر عوام کو متاثر کرسکتے ہیں، جو نہیں جانتے کہ ہمارے دشمن نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ (ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"Israeli academia is directly complicit in the crimes of the state".
("Aljazeera". September 10, 2024)

بقیہ: انتخابات کا سال: جمہوریت کا امتحان

اندرونی اختلافات کا شکار ہے۔ فرانس میں انتہائی دائیں اور انتہائی بائیں بازو کی جماعتوں کی کامیابی کے بعد حکومت بنانے میں دو ماہ لگے۔ نیدرلینڈز میں جولائی میں ایک ٹیکنوکریٹ کو وزیراعظم بنانا پڑا کیونکہ حکمران جماعتیں حکومت کے سربراہ پر اتفاق نہیں کرسکیں۔

۲۰۲۴ء کے انتخابات نے جمہوریت کو اب تک کے سب سے بڑے امتحان سے گزارا ہے۔ اگر امریکا میں اقتدار پرامن طریقے سے منتقل ہوگیا تو یہ دنیا بھر میں سیاسی آزادی کے لیے اعتماد کا باعث بنے گا۔ تاہم امریکا میں پُرامن انتقالِ اقتدار کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔

"Over a billion have voted in 2024: Has democracy won?" ("The Economist". October 6, 2024)

خُوراک کے عَالمگِیر بُحران کی باری؟

دنیا بھر میں میٹھا پانی بے دریغ استعمال کیا جارہا ہے اور ری سائیکل بھی نہیں کیا جارہا ہے جس کے نتیجے میں ایکوسسٹم کے بگڑنے سے خوراک کی فصلوں کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔

دنیا بھر میں ماحول کو پہنچنے والے نقصان کے نتیجے میں بہت کچھ الٹ پلٹ کر رہ گیا ہے۔ کہیں گرمی بہت زیادہ پڑ رہی ہے تو کہیں بارشیں بہت زیادہ ہورہی ہیں۔ کہیں سردی بڑھ گئی ہے تو کہیں کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ کب سردی پڑے اور کب گرمی بڑھ جائے۔

ماحول میں رونما ہونے والی منفی تبدیلیوں نے تقریباً تمام ہی متعلقہ معاملات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ بہت سے شعبے شدید عدم توازن کا شکار ہوکر رہ گئے ہیں۔ ماحول کی گراوٹ زندگی کا معیار بھی گرا رہی ہے۔ یہ گراوٹ سبھی کچھ داؤ پر لگا رہی ہے۔ ماہرین پریشان ہیں کہ اب معاملات کو درست کرنے کی سبیل کیسے نکالی جائے۔ ہر شعبہ اپنے اسٹیکز کو بچانے کے لیے فعال ہے۔ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ اُس کے مفادات کو ذرا سا بھی نقصان پہنچے۔ کسی بھی شعبے کی کارکردگی سے ماحول کو شدید نقصان پہنچ رہا ہو تب بھی کوشش یہ کی جاتی ہے کہ یہ سلسلہ برقرار رہے یعنی کچھ بھی نہ بدلے۔ اگر کسی شعبے کو محض حسنِ اتفاق سے کچھ مل جائے تو وہ اُسے دانتوں سے پکڑ کر رکھتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ معاملات دوبارہ نارمل نہ ہوں، بگاڑ چلتا ہی رہے۔

ماحول کے معیار کے گرنے سے کہیں خشک سالی اتنی بڑھ گئی ہے کہ فصلیں خطرے میں پڑ گئی ہیں اور کہیں پانی اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ فصلیں اگانا دوبھر ہوگیا ہے۔ یہ سب کچھ عدمِ توازن کا نتیجہ ہے۔ حکومتیں اصلاحِ احوال کے لیے جتنی کوششیں کر رہی ہیں، اُن سے کہیں زیادہ کوششیں بگاڑ کو برقرار رکھنے کے لیے کی جارہی ہیں۔

ماہرین نے بتایا ہے کہ دنیا بھر میں پانی کا بحران گہرا ہوتا جارہا ہے۔ کہیں پانی بالکل نہیں یا ضرورت سے بہت کم ہے اور کہیں پانی بہت زیادہ ہے۔ بارشیں بہت زیادہ ہوں تو بھی فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور پانی کم برسے تب بھی فصلیں مطلوب معیار کے مطابق اگائی نہیں جاسکتیں یا پھر اُن سے مطلوب حد تک پیداوار حاصل نہیں ہوسکتی۔

پانی کا عالمگیر بحران اب چونکہ فصلوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہورہا ہے، اس لیے اگلے پچیس برس میں دنیا بھر میں خوراک کی پیداوار خطرناک حد تک کم ہوجانے کا خدشہ ہے۔

دنیا بھر میں پینے کے صاف پانی کے قدرتی ذخائر گھٹتے جارہے ہیں۔ گلیشیرز کے پگھلنے پر پہاڑوں سے بہتے ہوئے ندیوں اور دریاؤں میں گرنے والے پانی سے استفادہ کم ہو پارہا ہے اور ضیاع زیادہ۔ بارشوں کا پانی بھی دریاؤں سے ہوتا ہوا سمندروں میں جا گرتا ہے۔ اس پانی سے بھی خاطر خواہ حد تک استفادہ ممکن نہیں ہو پارہا۔ دنیا بھر میں ماہرین اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ گلیشیرز سے آنے والے اور بارش کے پانی سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے، مستفید ہوئے بغیر اُسے سمندروں میں گرنے نہ دیا جائے۔ اس کے باوجود حکومتیں کچھ خاص کر نہیں پارہیں۔

دنیا بھر میں میٹھے پانی کے ذخائر شدید خطرات کی زد میں ہیں۔ حکومتوں کی منصوبہ بندی اچھی خاصی ہونے کے باوجود کم پڑ جاتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی حکومتوں نے معاملات کو بہت حد تک درست کرلیا ہے تاہم ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں اس حوالے سے کچھ خاص یا اطمینان بخش نہیں کیا جاسکا ہے۔ عوام میں شعور کی سطح بھی بلند نہیں۔ وہ اپنے نفع نقصان کے بارے میں زیادہ سوچ نہیں پاتے اور ماحول کو ایسا نقصان پہنچنے دیتے ہیں جس سے بالآخر اُنہی کو نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

آبی معاملات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ دنیا بھر میں میٹھے پانی کے ذخائر پر دباؤ بڑھ رہا ہے۔ گلیشیرز سے پگھل کر آنے والے پانی کو کنٹرول کرکے اُس سے زیادہ استفادہ ممکن نہیں ہو پارہا اور دوسری طرف بارشوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والے پانی سے بھی خاطر خواہ حد تک استفادہ ممکن نہیں ہو پارہا۔ سب سے بڑا مسئلہ عوام کی تربیت کا ہے۔ اُن میں متعلقہ شعور خاطر خواہ حد تک بلند نہیں کیا جاسکا ہے۔

میٹھے پانی کے ذخائر کے نظم و نسق کا معاملہ درست نہ کیا جاسکا تو اگلے پچیس برس میں خوراک کا بحران انتہائی نوعیت کی شکل اختیار کرکے ہمارے سامنے کھڑا ہوگا۔ یہ بحران پوری دنیا کو لپیٹ میں لے چکا ہوگا۔ متعلقہ امور کا جائزہ لے کر ماہرین نے خبردار کیا ہے کہ دنیا بھر میں میٹھے پانی کا مسئلہ خطرناک شکل اختیار کرچکا ہے۔ اس وقت بھی دنیا کی نصف آبادی پینے کے صاف پانی یعنی میٹھے پانی تک رسائی سے یا تو محروم ہے یا پھر انتہائی مشکلات کا سامنا کر رہی ہے۔

گلوبل کمیشن آن اکنامکس آف واٹر نے ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ ماحول کو پہنچنے والے نقصان کا گراف بلند ہوتے جانے سے دنیا بھر میں میٹھے پانی تک رسائی محدود سے محدود تر ہوتی جارہی ہے۔ پسماندہ ممالک میں اربوں افراد کو اس حوالے سے غیر معمولی مشکلات کا سامنا ہے۔

میٹھے پانی کی رسد میں تیزی سے کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔ رواں عشرے کے خاتمے تک دنیا بھر میں میٹھے پانی کی رسد میں ۴۰ فیصد کمی واقع ہوگی۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں کس قدر خرابی پیدا ہوگی۔ پینے کی ضرورت کے علاوہ میٹھا پانی صنعتی اور تجارتی استعمال کے لیے بھی ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر اس پانی سے فصلیں تیار ہوتی ہیں۔ میٹھے پانی کی کمی سے فصلوں کو پہنچنے والا نقصان دنیا بھر میں خوراک کی شدید قلت کا باعث بن سکتا ہے اور بنے گا۔ دنیا بھر میں میٹھے پانی کے ذرائع شدید دباؤ میں ہیں۔ گلوبل کمیشن آن اکنامکس آف واٹر کی رپورٹ کے مطابق اربوں انسانوں کو خوراک کی قلت کا سامنا ہے۔ اگر میٹھے پانی کے ذخائر پر دباؤ یونہی بڑھتا رہا تو خوراک کا بحران گہرا ہوتا جائے گا۔

کمیشن کی رپورٹ میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بیشتر حکومتوں نے عام آدمی کی میٹھے پانی کی یومیہ ضرورت کا غلط تخمینہ لگایا ہے۔ حکومتوں کا اندازہ ہے کہ عام آدمی کو صاف ستھری اور صحت بخش زندگی بسر کرنے کے لیے یومیہ ۵۰ سے ۱۰۰ لیٹر میٹھا پانی درکار ہوتا ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ کسی بھی انسان کو حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق یعنی ڈھنگ سے جینے کے لیے یومیہ کم و بیش چار ہزار لیٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسم و جاں کی راحت کے لیے پانی کی یہ مقدار ناگزیر ہے۔ یومیہ چار ہزار لیٹر میٹھا پانی صرف پینے یا صفائی ستھرائی کے لیے نہیں بلکہ دیگر تمام لازمی امور کے لیے درکار ہے۔ اس میں فصل اگانے کے علاوہ صنعتی عمل بھی شامل ہے۔ لوگ گھروں میں مویشی بھی تو پالتے ہیں۔ انہیں بھی پانی درکار ہوتا ہے۔ مویشیوں کا چارا بھی تو میٹھے پانی ہی سے اُگتا ہے۔ جن خطوں کو میٹھا پانی کافی مقدار میں نہیں مل پاتا وہ خوراک، کپڑا اور دیگر اشیائے صرف درآمد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

بہت سے ملک سبز پانی سے استفادہ کرتے ہوئے معقول زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ زمین کی نمی ہوتی ہے جو ماحول کو خوش گوار بناتی ہے۔ زمین میں پائی جانے والی نمی خوراک کی فصلیں اگانے کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔ اس کے

مقابل نیلا پانی ہے جو دریاؤں اور تالابوں سے حاصل ہوتا ہے۔ گلوبل کمیشن آن اکنامکس آف واٹر کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر میں پانی ماحولی دریاؤں کے ذریعے گھومتا رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں نمی بھی منتقل ہوتی ہے اور ایک خطے کو سیراب کرنے کے بعد دوسرے خطے کو فیض پہنچاتی ہے۔

دنیا بھر میں خشکی پر بارش کا نصف پانی ماحول میں پائے جانے والے مستحکم سبزے سے آتا ہے جو پانی کو دوبارہ فضا میں اُچھال کر بادلوں کی تشکیل کی راہ ہموار کرتا ہے اور یوں بارشیں ہوتی ہیں اور خطے سیراب ہوتے ہیں۔

نمی کی منتقلی سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے ممالک میں چین اور روس نمایاں ہیں جبکہ بھارت اور برازیل اس نمی کو ''برآمد'' کرنے والے ممالک میں سب سے آگے ہیں۔ ان دونوں ملکوں کی زمین نمی کو بہت بڑے پیمانے پر ایک خطے سے دوسرے خطے میں منتقل کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں کسی بھی ملک کے حصے میں آنے والی بارش کا ۴۰ سے ۶۰ فیصد پڑوسیوں کی زمین کی معرفت ہوتا ہے۔

گلوبل کمیشن آن اکنامکس آف واٹر کے شریک چیئر مین اور پوٹسڈیم انسٹیٹیوٹ فار کلائمیٹ امپیکٹ ریسرچ کے ڈائریکٹر پروفیسر جوہان راکسٹرام کہتے ہیں کہ روس کی معیشت کا مدار بہت حد تک یوکرین، قازقستان اور بالٹک کے خطے میں موجود جنگلات کے برقرار رہنے پر ہے۔ یہ جنگلات جتنے توانا ہوں گے، روسی علاقوں پر اُتنی ہی زیادہ بارش ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ نمی بھی منتقل ہوگی۔ ان کا کہنا ہے کہ یہی کیس ارجنٹائن کا بھی ہے جسے پڑوسی برازیل سے نمی کے ساتھ ساتھ میٹھا پانی بھی منتقل ہوتا ہے۔ اُن کے مطابق ملکوں اور خطوں کے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہونے کی حقیقت ہمیں اس بات کی تحریک دیتی ہے کہ عالمی معیشت میں ایک مشترکہ مفاد کے طور پر میٹھے پانی کو غیر معمولی اہمیت دیں اور اس حوالے سے نئی پالیسی، نئی حکمتِ عملی تیار کریں۔

سنگاپور کے صدر اور گلوبل کمیشن آن اکنامکس آف واٹر کے شریک چیئر مین تھرمن شمگا رتنم کہتے ہیں کہ دنیا بھر کے ممالک کو مزید وقت ضائع کیے بغیر اب میٹھے پانی کے حوالے سے باہمی تعاون کا گراف بلند کرنا چاہیے۔

شمگا رتنم کہتے ہیں ''میٹھے پانی کے ذرائع کو حقیقی تحفظ فراہم کرنے کے لیے ہمیں اب انقلابی انداز سے سوچنا ہوگا۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ ہم مزید وقت ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ میٹھے پانی کو بروئے کار لانے کے حوالے سے سوچ تبدیل کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ گھروں میں جو پانی استعمال ہوجاتا ہے، اُسے دوبارہ قابلِ استعمال بنانے پر بھی خاطر خواہ توجہ دی جانی چاہیے۔ میٹھے پانے کو ضائع ہونے سے بچانے یا دوبارہ قابلِ استعمال بنانے کے لیے لازم ہے کہ گھروں میں پانی کی لائنیں الگ الگ ہوں اور استعمال شدہ پانی الگ الگ جمع کیا جائے۔ پینے کا صاف پانی چونکہ انتہائی بنیادی ضرورت ہے، اس لیے اِس کا ضیاع کسی بھی حال میں برداشت نہیں کیا جانا چاہیے۔ جو لوگ میٹھے پانی کی ضیاع کے مرتکب پائے جائیں، اُنہیں انتباہ کیا جائے یا پھر اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ اگر گھروں میں استعمال ہونے والا میٹھا پانی استعمال کے بعد زیادہ آلودہ نہ ہوا ہو تو پیڑ پودوں کو دیا جاسکتا ہے، مویشیوں کو پلایا جاسکتا ہے۔ یہی پانی چھڑکاؤ کے کام بھی آسکتا ہے۔

''گلوبل کمیشن آن اکنامکس آف واٹر'' ۲۰۲۲ء میں نیدرلینڈز (ہالینڈ) میں قائم کیا گیا تھا۔ درجنوں سائنس دانوں اور ماہرینِ معاشیات نے مل کر ایک بڑی تنظیم کا خاکہ تیار کیا تاکہ دنیا بھر میں میٹھے پانی کو ضائع ہونے سے بچانے کی جامع حکمتِ عملی تیار کی جاسکے اور اس حوالے سے متعلقہ کمیونٹیز اور ممالک کو متحرک کیا جائے۔ دنیا بھر میں میٹھے پانی کے ذرائع پر بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث لازم ہوگیا ہے کہ حکومتیں اور خطے مل بیٹھ کر جامع حکمتِ عملی تیار کریں اور اشتراکِ عمل کے ذریعے ایک دوسرے کی مدد کریں۔

گلوبل کمیشن آن اکنامکس آف واٹر کی ۱۹۴ رصفحات کی رپورٹ میٹھے پانی کے ذخائر پر مرتب ہونے والے دباؤ کے مطالعے اور اصلاحِ احوال سے متعلق تجاویز کے حوالے سے اب تک کی سب سے بڑی اور سب سے وقیع رپورٹ ہے۔

دنیا بھر میں ہائیڈرولوجیکل سسٹمز پر مرتب ہونے والے دباؤ کو سمجھنے کے لیے مشترکہ کاوشوں کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں اشتراکِ عمل لازم ہے۔ میٹھے پانی کے ذرائع یا ذخائر چاہے کسی بھی ملک میں ہوں، مجموعی طور پر پوری دنیا کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ ماحول کسی سرحد کا پابند یا محتاج نہیں۔ گلوبل کمیشن کی رپورٹ میں میٹھے پانی کے بحران سے نمٹنے سے متعلق تمام اہم تجاویز کا جائزہ لیا گیا ہے اور ایسی جامع حکمتِ عملی کی راہ ہموار کی گئی ہے جس کے ذریعے ہم اپنے لیے اور آنے والی نسلوں کے لیے اس مسئلے کو بہت حد تک حل کرسکتے ہیں۔ پالیسی میکرز کی راہ نمائی کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

جوہان راکسٹرام کہتے ہیں کہ گلوبل کمیشن آن اکنامکس آف واٹر نے تحقیق کے نتیجے میں جو کچھ معلوم کیا وہ انتہائی پریشان کن ہے۔ ماحول میں رونما ہونے والی انتہائی نوعیت کی تبدیلیوں کا ہدف نمبر ایک ہے میٹھا پانی۔ دنیا بھر میں میٹھے پانی کی قلت اس لیے بڑھ رہی ہے کہ ماحول میں رونما ہونے والی تبدیلیاں سب سے زیادہ میٹھے پانی ہی کو نشانہ بنارہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں کرۂ ارض کا پورا ایکو سسٹم ہی کھٹائی میں پڑتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ خطرناک تبدیلی سب سے زیادہ خشک سالی اور موسلا دھار بارشوں کی شکل میں نمایاں ہوئی ہے۔ کہیں بالکل پانی نہیں اور کہیں اتنا زیادہ ہے کہ سنبھالا نہیں جاتا بلکہ نقصان پہنچا رہا ہوتا ہے۔

شدید گرمی کی لہریں (ہیٹ ویوز) اور جنگلات میں لگنے والی آگ زمین کی قدرتی نمو کے لیے انتہائی خطرناک اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ جنگلات میں لگنے والی آگ سے پورے کے پورے علاقے نمی سے محروم ہوجاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں زمین کی زرخیزی خطرناک حد تک متاثر ہوتی ہے۔

جب درجہ حرارت بلند ہوتا ہے تو زمین کی نمی کے ماحول میں شامل ہونے کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں بارشوں کا نظام بگڑتا ہے اور یوں کہیں اچانک بہت زیادہ بارش ہونے لگتی ہے اور کہیں لوگ بادلوں کو دیکھ دیکھ کر صرف کڑھتے ہی رہتے ہیں۔ انسان قدرت کے قائم کردہ نظام کو بگاڑ کر ختم کر رہا ہے۔ جنگلات کے درختوں کی تیز رفتار کٹائی اور بھیگی ہوئی زمینوں کے خشک ہوجانے سے پورے ایکو سسٹم میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ درختوں کی شکل میں سبزے کے ذریعے اور زمین سے ملنے والی نمی کی شکل میں میٹھے پانی کے قدرتی ذرائع پروان چڑھتے ہیں۔ جب جنگلات بہت زیادہ کاٹے جاتے ہیں اور زمین تیزی سے خشک ہوتی ہے تو میٹھے پانی کے ذرائع بھی غیر متوازن ہوجاتے ہیں۔

گلوبل کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ زرعی شعبے کو دی جانے والی غلط سبسڈی بھی بگاڑ کا دائرہ وسیع تر کرتی جارہی ہے۔ دنیا بھر میں ہر سال زرعی شعبے کو کم و بیش ۷۰۰ ارب ڈالر کی سبسڈی دی جاتی ہے اور اس کا بڑا حصہ غلط سمت میں چلا جاتا ہے جس سے ایکو سسٹم کو لاحق خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ میٹھے پانی کو ری سائیکل کرنے یعنی دوبارہ قابلِ استعمال بنانے پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جارہی۔ دنیا بھر میں صنعتیں جو پانی استعمال کرتی ہیں اُس کا ۸۰ فیصد ندی نالوں سے ہوتا ہوا دریاؤں اور پھر سمندروں میں جاملتا ہے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Global water crisis leaves half of world food production at risk in next 25 years".
("theguardian.com". October 16, 2024)

سوشل میڈیا نیٹ ورکس: تباہی یا امکانات؟

حسان احمد

برطانوی پولیس اس وقت اپنی نوعیت کے پہلے اور ایک انوکھے معاملے کی تحقیقات کر رہی ہے۔ برطانوی اخبار ''دی گارڈین'' کے مطابق ایک سولہ سالہ نوجوان لڑکی نے 'میٹاورس' (Metaverse) میں اپنے ساتھ ہونے والی غیر حقیقی اجتماعی زیادتی (Virtual gang rape) کی رپورٹ پولیس کو دی ہے۔ تفصیلات کے مطابق وہ لڑکی ورچول ریلیٹی (Virtual reality) ھیڈ سیٹ پہنے 'میٹاورس' میں ایک حقیقت سے قریب (Immersive game) کھیل رہی تھی، جب اس کے ساتھ کھیلنے والے دوسرے کرداروں نے اس کے خاکے یا کارٹون کریکٹر (Digital Avatar) پر حملہ کیا اور اسے زیادتی کا نشانہ بنایا۔ اس خبر کے منظر عام پر آنے کے بعد مختلف سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر اس لڑکی کو تضحیک یا ٹرولنگ (Trolling) کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی نے کہا کہ مختلف کمپیوٹر کھیل کھیلتے ہوئے وہ کھیل ہی کھیل میں مر چکے ہیں، تو کیا وہ اس کے لیے قتل کا مقدمہ درج کرائیں، تو کسی کے خیال میں پولیس کو حقیقی زندگی میں ہونے والے جرائم پر توجہ دینی چاہیے۔

'میٹاورس' کو سوشل میڈیا نیٹ ورکس کا مستقبل کہا جاتا ہے۔ 'میٹاورس' کیا ہے؟ اس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے، لیکن اس سے قبل سوشل میڈیا نیٹ ورکس کو سمجھنا ضروری ہے۔ ویسے تو انٹرنیٹ کا آغاز ہی ایک دوسرے سے کوسوں دور بیٹھے چند لوگوں کے درمیان کمپیوٹر پر گفتگو سے ہوا تھا، لیکن سوشل میڈیا نیٹ ورکس نے صرف ابلاغ کے ذرائع کو ہی تبدیل نہیں کیا بلکہ فرد، خاندان، معاشرہ، ٹیکنالوجی، حتیٰ کہ زندگی کے فلسفے کو بھی تبدیل کر دیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر مختلف سوشل میڈیا پلیٹ فارمز نہ ہوتے تو نہ اسمارٹ فونز کو ہماری زندگی میں یہ اہمیت حاصل ہوتی اور نہ مصنوعی ذہانت (AI) کو ایسا عروج حاصل ہوتا کہ اس کا خطرہ ایٹم بم سے زیادہ بڑھ جاتا۔

فیس بک، ایکس (سابقہ ٹویٹر)، گوگل، انسٹاگرام، واٹس ایپ اور دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے سوشل نیٹ ورک ہماری زندگیوں پر کیسے اثر انداز ہو رہے ہیں؟ ہمارے سوچنے سمجھنے سے لے کر زندگی بسر کرنے کے طریقے کیسے تبدیل ہو رہے ہیں اور مستقبل کیسا ہوگا؟ اگلی سطور میں انہی سوالات کا جواب جاننے کی کوشش کریں گے۔

گلوبل ولیج سے کنویں کا مینڈک بننے تک کا سفر

کینیڈین مفکر مارشل مک لوہن نے ساٹھ کے عشرے میں میڈیا کی ترقی کو دیکھتے ہوئے 'گلوبل ولیج' (عالمی گاؤں) کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ ان کے خیال میں الیکٹرانک میڈیا مثلاً ٹیلی ویژن، ٹیلی فون وغیرہ کی ایجاد نے دنیا کے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے۔ نصف صدی قبل پیش کی گئی یہ تھیوری اس وقت بھی بہت مقبول ہوئی تھی، لیکن شاید اس کو انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نیٹ ورکس نے قبول عام دے دیا اور یہ اصطلاح زبان زد عام ہوگئی۔

بظاہر تو سوشل میڈیا پلیٹ فارم روایتی میڈیا ہی کی ایک جدید اور ترقی یافتہ شکل نظر آتے ہیں، لیکن ان کے اثرات بالکل مختلف ہیں۔ جہاں میڈیا کو دنیا کو جاننے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا تو سوشل میڈیا کو ایکو چیمبرز سے تشبیہ دی جا رہی ہے، کیونکہ بیشتر اوقات سوشل میڈیا پلیٹ فارمز آپ کو وہی کچھ دکھاتے ہیں جو آپ پسند کرتے ہیں۔ یہ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز، چند الگورتھم کی مدد سے آپ کی پسند ناپسند کو دیکھ کر اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ آپ کی ترجیحات کیا ہیں؟ اور مسلسل صرف وہ چیزیں دیکھ کر جو ہمیں پسند ہیں، ہم محض کنویں کا مینڈک بنتے جا رہے ہیں۔

کیا دنیا کو چند الگورتھمز سنبھال رہے ہیں؟

کمپیوٹر کی زبان میں 'الگورتھم' ایسی ہدایات یا طریقہ کار کو کہتے ہیں جس پر عمل کر کے کمپیوٹر کسی مسئلے کو حل کرتے ہیں۔ جتنا ہی مشکل مسئلہ ہوتا ہے اتنا ہی پیچیدہ 'الگورتھم' اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے اور انسانی نفسیات سے کھیلنے سے زیادہ پیچیدہ کام شاید ہی اس دنیا میں کوئی ہو۔ لیکن سوشل میڈیا نیٹ ورکس نے اس مسئلے کو نہ صرف اپنی دانست میں حل کر لیا ہے بلکہ انسانیت اب ان 'الگورتھم' کے رحم و کرم پر ہی ہے۔ ایک زمانے میں 'فیس بک' کا نعرہ تھا کہ 'تیز چلو اور توڑ دو' (Move fast and break things)۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے پلیٹ فارمز پر لانے، ان کو زیادہ دیر تک مصروف رکھنے اور ان سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے چکر میں صورتحال پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی رہی اور مصنوعی ذہانت اس پر سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی ہے۔ یونیورسٹی کالج لندن کی ماہر حسابیات اور اپنی کتاب 'Being Human in the Age of Algorithms First' کے لیے مشہور حنا فرائے (Hannah Fry) کے خیال میں:

الگورتھمز کے اس دور میں جہاں مشینوں کی حکمرانی ابھرتی نظر آ رہی ہے۔ یہ چند مخمصے ابتدائے محض ہیں، جن کا سامنا ہم کر رہے ہیں۔ ہم کو کیا دیکھنا ہے، کہاں جانا ہے، کس کو پسند کرنا ہے یہاں تک کہ کس کو جیل بھیجنا ہے، اس کا فیصلہ پہلے ہی یہ الگورتھمز کر رہے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ہمارا بھروسا ان الگورتھمز پر بڑھ رہا ہے، یہ سوال اہم ہوتا جا رہا ہے کہ ہم کس قسم کی دنیا چاہتے ہیں اور کیا چیز سب سے اہم ہے؟ ہم کو ایسی دنیا نہیں بنانی جہاں مشینیں ہم کو بتائیں کہ ہمیں کیا کرنا اور کس طرح سوچنا ہے؟ لیکن شاید ایسی دنیا سے فرار اب ممکن نہیں۔

مصنوعی ذہانت: پیدا شدہ گمبھیر صورتحال

عام طور پر سوشل میڈیا پلیٹ فارمز آپ کی پسند اور ناپسند کو دیکھتے ہوئے آپ کا ایک نفسیاتی خاکہ بناتے ہیں اور پھر اسی خاکہ کو دیکھتے ہوئے آپ کو مواد دکھایا جاتا ہے۔ یہ 'الگورتھمز' ہر وقت آپ کے بارے میں اپنی رائے کو بہتر سے بہتر بناتے رہتے ہیں۔ جب تک یہ 'الگورتھمز' انسان بنا رہے تھے، تب تک ان کو سنبھالنا بھی آسان تھا۔ مثلاً جب سوشل میڈیا پر جعلی خبروں کی بھرمار ہوئی تو ان سے مقابلہ کرنے کے 'الگورتھمز' بنائے گئے اور پہلے سے موجود 'الگورتھمز' کو بہتر بنایا گیا۔ لیکن اب بہت تیزی سے ان 'الگورتھمز' کو مصنوعی ذہانت کی مدد حاصل ہو رہی ہے اور مصنوعی ذہانت جب یہ فیصلہ کرنے لگے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں، تو نہ صرف انسان بے اختیار ہو جاتے ہیں بلکہ کسی حد تک آگے ہونے والی غلطیوں سے بری الذمہ بھی۔ یعنی ایک طرف تو یہ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز ہماری روزمرہ کی زندگی سے لے کر کس کو حکمران بنانا ہے، تک کے فیصلوں میں دخل دے رہے ہیں، اور دوسری طرف یہ کسی قسم کی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں کیونکہ کیا دکھانا ہے اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ اب انسان نہیں مصنوعی ذہانت کے 'الگورتھمز' کر رہے ہیں۔

امریکی صدارتی امیدوار ڈونلڈ ٹرمپ پر قاتلانہ حملے کی خبر جب پھیلی تو فیس بک نے زخمی ڈونلڈ ٹرمپ کی مکا لہرانے کی تصویر کو اپنے پلیٹ فارم پر سے ہٹانا شروع کر دیا، جس کی وجہ سے فیس بک کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کے فیس بک کے سی ای او مارک زکر برگ کو اپنے کاروباری مفاد کے تحفظ کے لیے ڈونلڈ ٹرمپ کو فون کر کے معافی بھی مانگنی پڑی۔

یہ صورتحال اس وقت بھی پیش آئی، جب سابق فلسطینی وزیر اعظم اسماعیل ہانیہ کی شہادت کے فوراً بعد فیس بک نے اس خبر کو اپنے پلیٹ فارم پر سنسر کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ملائشیا کے وزیر اعظم انور ابراہیم کی تعزیتی پوسٹ بھی ہٹادی گئی، جس پر ملائشیا کی حکومت نے کافی احتجاج کیا۔

آزادئ اظہار سے آزادئ انتخاب تک کی بحث

لیکن سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر سنسر شپ کی یہ مہم نئی نہیں ہے۔ فیس بک، ٹویٹر اور گوگل نے ۲۰۱۶ء کے امریکی انتخابات میں Cambridge Analytica Data Scandal کے سامنے آنے کے بعد ۲۰۲۰ء کے انتخابات میں ڈونلڈ ٹرمپ کو سنسر کرنا شروع کر دیا۔ انہیں 'شیڈو بین الگورتھم' (Shadowban Algorithm) کا نام دیا گیا۔ یعنی اگر آپ اپنے پلیٹ فارم پر سے کسی طاقتور شخصیت یا کسی مقبول نظریے کو ہٹا نہیں سکتے تو اس کو اپنے پلیٹ فارم پر 'الگورتھمز' کی مدد سے اس طرح پھیلنے سے روک دیں۔ اس بات پر ان پلیٹ فارمز کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا، وہیں مشہور امریکی کاروباری ایلون مسک نے 'آزادئ اظہار کے تحفظ کے لیے' ٹویٹر کو مہنگے داموں خرید لیا۔ اس کے محرک مشہور ٹیکنالوجسٹ پیٹر تھیل بنے، جو نہ صرف ایلون مسک کے کاروباری ساتھی رہے ہیں، بلکہ فیس بک کے ابتدائی انویسٹرز میں سے ایک ہیں۔

دُنیا کے دو بڑے سوشل میڈیا پلیٹ فارموں پر پیٹر تھیل کس اثر و رسوخ کا حامل ہے، اس کا اندازہ اس خبر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ نے اگلے امریکی صدارتی انتخابات کے لیے اپنے سخت ترین مخالف جے ڈی ونس (J D Vince) کو نامزد کیا جو اس سے قبل 'ٹرمپ دوبارہ نہیں' یا 'Trump Never Again' کا نعرہ لگاتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان مفاہمت کا کردار کسی سیاست دان یا تجربہ کار بیوروکریٹ نے نہیں بلکہ ارب پتی ٹیکنالوجسٹ پیٹر تھیل نے ادا کیا ہے، جو ایک طرف جے ڈی ونس کے کاروباری ساتھی ہیں تو دوسری طرف ڈونلڈ ٹرمپ کے مشیر خاص بھی۔ یہ خبر بھی شاید دلچسپی کا باعث ہو کہ حالیہ فلسطین اسرائیل جنگ میں معصوم فلسطینیوں کے قتل عام میں بدترین کردار ادا کرنے والا مصنوعی ذہانت کا سوفٹ ویئر بھی پیٹر تھیل کی کمپنی نے بنایا ہے۔

آزادئ اظہار مغرب کے لیے محض ایک ہتھیار ہے، اس سے کون ناواقف ہے۔ تاہم، 'الگورتھمز' کا یہ عروج کتنا خطرناک ہے اور یہ 'الگورتھمز' یا ان کے بنانے والے کیسے ہماری نفسیات سے کھیلتے ہیں؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ ایکس پلیٹ فارم کے بانی جیک ڈورسی اب آزادئ اظہار کی بحث کو محض توجہ ہٹانے کا ذریعہ کہتے ہیں۔ اور ان کے خیال میں اصل بحث 'الگورتھمز' کو استعمال کرنے یا نہ کرنے کی آزادی پر ہونی چاہیے۔ ایک انٹرویو میں جب انہوں نے یہ گفتگو کی تو ایکس پلیٹ فارم کے نئے مالک ایلون مسک بھی اس بات سے انکار نہ کرسکے۔ بقول جیک ڈورسی:

شاید یہ آپ کو عجیب لگے لیکن (آج کے دور میں) میرے خیال میں آزادئ اظہار کی باتیں محض توجہ ہٹانے کا طریقہ ہیں۔ میرے خیال میں اصل بحث آزاد یا خود اختیاری سوچ پر ہونی چاہیے۔ اور اب ہم نے اس بات کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کیونکہ ہماری سوچ یا مرضی کو (سوشل میڈیا الگورتھمز کے ذریعے) بدلا جارہا ہے۔ اور میرے خیال میں اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے لوگوں کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ اس بات کا تعین خود کرسکیں کہ وہ کون سا الگورتھم استعمال کرنا چاہتے ہیں اور کون سا نہیں۔

مخالفین کی آواز کو کیسے دبایا جارہا ہے؟

تقریباً تمام ہی بڑی اور طاقتور سوشل نیٹ ورکس کمپنیاں کسی نہ کسی طرح جہاں ایک طرف 'منتخب کردہ نظریات' کو پروان چڑھانے کے لیے نہ صرف مکمل آزادی دیتی ہیں بلکہ مختلف 'الگورتھمز' کے ذریعے ان کی بات کو اپنے اپنے پلیٹ فارمز پر بڑے پیمانے پر پھیلاتی ہیں تو دوسری طرف مخالف آواز کو بالکل دبا دیتی ہیں۔ یعنی آپ کو اپنی بات کہنے کی آزادی تو ہے، لیکن اپنی بات کو پھیلانے کی آزادی نہیں ہے۔ اسے 'Freedom of Speech, Not Freedom of Reach' کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی جہاں ایک 'پسندیدہ شخصیت' کی پوسٹ ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف دکھائی جاتی ہے، تو دوسری طرف مخالفین کی پوسٹ کو چند سو لوگوں کو بھی نہیں دکھایا جاتا ہے۔

آسان الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ اگر کسی فلسطینی مقصد کی حمایت کرنے والے کی آواز سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر دبانی ہو تو یہ پلیٹ فارمز اپنے ریکارڈ یا ڈیٹا بیس میں اس کے نام کے آگے ایک منفی نشان لگادیں گے اور پھر اس کو اپنی بات کہنے کی تو مکمل آزادی ہوگی لیکن اس کا پیغام بہت کم ہی لوگ دیکھ پائیں گے۔ یہ باتیں کوئی سازشی نظریات نہیں بلکہ ان سوشل نیٹ ورکس کمپنیوں کے بے شمار ملازمین اس موضوع پر خفیہ دستاویزات سامنے لاچکے ہیں کہ یہ کمپنیاں کس طرح آزادئ اظہار کے نام پر آزادئ اظہار کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔

ان سب میں سب سے توانا اور منظم آواز گوگل کے سابق سوفٹ ویئر انجینئر زیک وریز کی ہے، جنھوں نے ۲۰۲۰ء کے امریکی انتخابات میں گوگل کی دھاندلیوں پر سے پردہ اٹھایا۔ زیک نے ۲۰۲۱ء میں اپنی کتاب 'گوگل لیکس: طاقتور ٹیکنالوجی سنسرشپ کو بے نقاب کرنے کی کہانی' یا Google Leaks: A whistleblower's expose of big tech censorship' میں تقریباً ایک ہزار خفیہ دستاویزات کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ کس طرح گوگل نے اپنے سرچ انجن اور یوٹیوب پر ڈونلڈ ٹرمپ کی الیکشن کمپین کو سنسر کرکے جو بائیڈن کے جیتنے کی راہ ہموار کی۔

کتاب کے مصنف کے مطابق ۲۰۱۶ء کے انتخابات سے قبل ہی گوگل کے بانیوں نے اپنا تمام وزن ہیلری کلنٹن کے پلڑے میں ڈالا ہوا تھا، لیکن تمام تر محنت کے بعد بھی جب نتائج اس کے برعکس آئے، تو ۲۰۲۰ء کے انتخابات سے قبل دائیں بازو کے 'پروپیگنڈا' کو باقاعدہ سنسر کرنے کا آغاز کیا اور پھر یہ سنسرشپ پھیلتی چلی گئی۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ زیک وریز کے مطابق ایلون مسک کے دعوؤں کے برعکس 'ایکس' پلیٹ فارم پر دیگر پلیٹ فارمز کی طرح شیڈو بین الگورتھم (Shadow banning algorithm) ابھی بھی اسی طرح فعال ہے جیسا کہ پہلے تھا اور ایلون مسک کے دعوے محض جھوٹ ہیں۔

سوشل میڈیا پر ثقافتی جنگ

ان طاقتور سوشل نیٹ ورکس کی یہ سنسر شپ مہم امریکا اور یورپ میں جاری ثقافتی جنگ، (Woke Culture War) میں بھی اہم کردار ادا کررہی ہے، جہاں 'آزادی، تنوع اور مساوات' کے نعرے کے مخالفین کو یہ پلیٹ فارمز مکمل طور پر سنسر کررہے ہیں۔ بظاہر خوبصورت نظر آنے والے ان نعروں کے پیچھے امریکا اور یورپ میں ہم جنس پرستی، اپنی جنس خود منتخب کرنے کی آزادی، غیرقانونی مہاجرین کو خوش آمدید کہنے کی پالیسی کو فروغ دیا جارہا ہے۔ یہ لبرل ذہنیت کس حد تک گرگئی ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پیرس اولمپکس کی افتتاحی تقریب میں انہی نظریات کے تحت نعوذ باللہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تضحیک کی گئی اور ابتدا میں اس کو سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر خوب پھیلایا گیا، لیکن پھر تنقید کے بعد یہ ویڈیوز کچھ پلیٹ فارمز پر سے ہٹادی گئیں۔

مسلم معاشروں کے لیے صورتحال کی نزاکت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ پہلے ہم اپنے بزرگوں سے اسلام سیکھتے

تھے، پھر یہ کام کتابوں نے لے لیا۔ آج کل یہ کام سوشل نیٹ ورکس نے سنبھالا ہوا ہے اور آگے چل کر یہ کام مصنوعی ذہانت سنبھال لے گی۔ اب ذرا تصور کیجیے کہ روزانہ دس سے بارہ گھنٹے اپنے اسمارٹ فون پر مختلف سوشل نیٹ ورکس پر گزارنے والی نوجوان نسل کو سنسرشپ کی مہم کے تحت مصنوعی ذہانت کے ذریعے اپنا من پسندیدہ تصورِ اسلام سکھایا جائے اور باقی سارے تصورات سنسر کر دیے جائیں، تو اگلے چند برسوں میں کیسی ہولناک صورت حال بن جائے گی۔

اس کی ایک جھلک ایسے دیکھی جاسکتی ہے کہ جب چیٹ جی پی ٹی (Chat GPT) اور 'ایکس' (ٹویٹر) کے اے آئی پروگرام گروک 'X AI program GROK' سے ۲۰ بڑی دہشت گرد تنظیموں کے نام اور مذہب کا پوچھا گیا تو ان دونوں پروگرامز نے صرف مسلم تنظیموں کے نام اور اسلام کا نام دکھایا۔ گویا مصنوعی ذہانت کو سکھا دیا گیا ہے کہ دہشت گردی کو اسلام کے ساتھ جوڑنا ہے۔

پہلی پاکستانی ڈیجیٹل خاتون ماڈل کا ظہور

سوشل نیٹ ورکس اور مصنوعی ذہانت کے گٹھ جوڑ سے اور کیا کیا تباہ کاریاں سامنے آئیں گی؟ اس کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ لیکن گزشتہ دنوں پاکستانی میڈیا پر چلنے والی اس خبر نے آپ کی توجہ ضرور حاصل کی ہوگی کہ انسٹاگرام پر پہلی پاکستانی اے آئی سوشل میڈیا انفلوینسر کی پروفائل لانچ کر دی گئی ہے۔ 'شبنم ایکسائی' (Shabnam Xai) نامی ڈیجیٹل خاتون ماڈل، مصنوعی ذہانت کی مدد سے بنائی گئی ہے، اپنی انسٹاگرام پروفائل پر مصنوعی ذہانت کی مدد سے ہی اپنی مختلف تصاویر ڈالتی ہے۔ یہ ڈیجیٹل انسان بنانے والا کون ہے؟ اس کی شناخت تو ظاہر نہیں کی گئی لیکن اس پروفائل پر مصنوعی ذہانت کی مدد سے کبھی مشرقی لباس پہنے تو کبھی مغربی لباس پہنے ایک خاتون کی تصاویر ڈالی جاتی ہیں۔ اس پروفائل کے بنتے ہی ۱۰ ہزار سے زیادہ لوگوں نے اسے فالو کر لیا تھا۔

انسٹاگرام نے جسے عریاں تصاویر (Soft Porn) پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، یہ پروفائل اس وقت تو اپنے پلیٹ فارم سے نامعلوم وجوہ کی بنا پر ہٹا دی ہے۔ لیکن ڈیجیٹل انسان (Virtual Models) کا تصور بہت تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہا ہے اور اسے آسان آمدنی کا ایک کامیاب ذریعہ سمجھا جا رہا ہے۔ ان پروفائلز پر جہاں بغیر کچھ محنت کیے مختلف کمپنیوں اور برانڈز کی تشہیر کی جاتی ہے، وہیں مختلف نظریات کو فروغ بھی دیا جاتا ہے۔

لیکن یہ صورت حال زیادہ پیچیدہ اور ہولناک اس لیے ہے کہ یہ سارا کام چند کمپیوٹر پروگرامز کے ذریعے ہو رہا ہے جس کی وجہ سے بہت ہی تھوڑی محنت سے بہت سارے مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً مصنوعی ذہانت سے لیس ایسے پروفائلز ان سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر بن چکے ہیں جو نہ صرف بالکل انسان لگتے ہیں بلکہ ساتھ میں انسانوں کی طرح گفتگو بھی کرسکتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ آپ کی پروفائل کا جائزہ لے کر آپ کا نفسیاتی خاکہ بنا کر آپ کی کمزوریوں اور رجحانات پر نظر بھی رکھ سکتے ہیں۔

فحاشی، نفرت اور جھوٹ کا کاروبار

ذرا تصور کریں کہ ایک نوخیز ذہن کو جو ابھی جوانی میں قدم رکھ رہا ہے اور نیا نیا ان سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کو استعمال کرنا شروع کرتا ہے، تو وہ ان خطرناک شکاریوں کے لیے کتنا آسان شکار ہے۔ یہ ڈیجیٹل پروفائلز اگر کسی فحش سوشل نیٹ ورک کے فروغ کے لیے بنائے گئے ہیں، تو یہ اس نوجوان کو اس کی مختلف کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر فحاشی کی طرف راغب کرسکتے ہیں، اور کوئی دوسرا پروفائل جو کسی منفی نظریے کو پھیلانے کے لیے بنایا گیا ہے، اس نوجوان کو کسی نفرت پھیلانے والے نظریے کی طرف بھی بلا سکتا ہے۔

لیکن یہ کام کوئی نیا نہیں ہے۔ اب یہ کام کم خرچ میں چند سوفٹ ویئرز کے ذریعے کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کافی عرصے سے یہی کام نوجوانوں کو بھرتی کر کے کروایا جاتا رہا ہے۔ انڈیا میں بی جے پی اور مودی کے حمایتیوں نے جہاں ان سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر نفرت انگیز ویڈیوز پھیلا کر مسلم کش فسادات کو ہوا دی ہے، تو پاکستان میں خیبر پختونخوا کی حکومت نے چند سال قبل تقریباً تیرہ سو نوجوانوں کو اس کام کے لیے ملازمت پر رکھا تھا کہ وہ کے پی حکومت کا مثبت چہرہ عوام کے سامنے لانے میں مدد دیں۔

برطانیہ میں حال ہی میں پھیلنے والے مسلم مخالف مظاہروں کو سوشل میڈیا پر کیسے بڑھایا گیا؟ اس پر ایک تفصیلی خبر ''ڈیلی میل'' نے دی ہے۔ ۴ اگست ۲۰۲۴ء کو چھپنے والی اس رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں مسلم مخالف مظاہروں کا ایک مرکزی کردار ٹومی رابنسن ہے۔ خبر کے مطابق ایکس (سابقہ ٹویٹر) پر تقریباً ۱۰ لاکھ فالوورز رکھنے والا ٹومی رابنسن جس وقت قبرص کے تفریحی مقام پر بیٹھا نفرت پھیلا رہا تھا اور ایکس پلیٹ فارم پر اس کی ایک ویڈیو کو چار کروڑ لوگ دیکھ چکے تھے، اس وقت اس کے سوشل میڈیا سپاہی برطانیہ میں لوٹ مار میں لگے تھے۔ واضح رہے کہ ٹومی رابنسن کا اصلی نام کچھ اور ہے، جو کہ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز استعمال کرنے کی ہدایات کی خلاف ورزی ہے لیکن اس کو پلیٹ فارم پر اس جعل سازی کے باوجود بات کرنے کی مکمل آزادی ہے۔

ایکس پلیٹ فارم نے جہاں ایک طرف مسلم کش فسادات کو ہوا دینے کے لیے ٹومی رابنسن نامی جعلی اکاؤنٹ کو کھلی آزادی دی ہوئی ہے، وہیں اس پلیٹ فارم پر برطانوی حکومت کا ایکس اکاؤنٹ قواعد وضوابط کی خلاف ورزی پر اس وقت بند کر دیا گیا جب برطانوی حکومت نے سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر فسادات پھیلانے والی پوسٹس کو پھیلانے والوں کو گرفتار کرنے کی دھمکی دی۔

ایلون مسک اپنی منفرد حیثیت کو اپنے پلیٹ فارم پر کیسے استعمال کر رہا ہے؟ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ برطانیہ میں مسلم کش فسادات کے شروع ہونے کے بعد اس نے ۲۰۱۳ء کی ایک ۱۰ سال پرانی خبر کو اپنے پلیٹ فارم پر پوسٹ کیا جس کے مطابق ایک مسلمان لڑکے نے ایک برطانوی لڑکی کے ساتھ زیادتی کی تھی اور اس پوسٹ کو محض چند گھنٹوں میں ۵ کروڑ لوگ دیکھ چکے تھے۔

اس سے زیادہ تشویشناک بات یہ ہے کہ فلسطینی خبررساں ویب سائٹ 'صدا سوشل' (Sada Social)، جسے 'الجزیرہ' جیسے مؤقر ادارے مدد دیتے ہیں، کے مطابق ان سوشل نیٹ ورکس کے مختلف ملازمین اس بات کی بار بار نشاندہی کر چکے ہیں کہ واٹس ایپ، فیس بک وغیرہ نے فلسطینیوں کا مواد یا ڈیٹا اسرائیل کو دیا ہے اور اسرائیل نے اسی مواد کو استعمال کرتے ہوئے ہزاروں فلسطینیوں کو نشانہ بنایا ہے لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

غزہ جنگ اور اسرائیلی پروپیگنڈا مشینیں

بعض محققین ٹومی رابنسن کا تعلق اسرائیل سے جوڑتے ہیں کیونکہ اسے جن مقدمات کا سامنا ہے ان پر ہونے والا خرچ چند اسرائیلی تنظیمیں اٹھا رہی ہیں۔ اور ان محققین کی نظر میں ٹومی رابنسن جیسے بے شمار سوشل میڈیا انفلوینسرز اسرائیل کے حالیہ جنگی جرائم کو چھپانے اور مسلم عیسائی تعلقات کو خراب کرنے کی منظم کوششوں میں ملوث ہیں۔

اسی طرح کی ایک اور خبر ''دی ٹائمز'' نے دی ہے۔ ۲ جون ۲۰۲۴ء کو چھپنے والی ایک رپورٹ کے مطابق اسرائیلی وزارت برائے تارکین وطن (Ministry of Diaspora) نے سوشل میڈیا پر سیاسی جماعتوں کی تشہیر کرنے والی کمپنی

اسٹوئیک (Stoic) کو دوملین ڈالر کی ادائیگی کر کے ہزاروں کی تعداد میں جعلی سوشل میڈیا اکاؤنٹس بنا کر ان کے ذریعے پروپیگنڈا کر کے سوشل میڈیا پر امریکی کانگریس کے اراکین بالخصوص سیاہ فام ارکان کانگریس کو غزہ جنگ میں اسرائیل کی حمایت کے لیے دباؤ میں لینے کی کوشش کی۔ یہ جعلی اکاؤنٹس ہولڈر امریکی بن کر ان اراکین کانگریس سے مطالبہ کرتے تھے کہ اسرائیل کی حمایت کرو ورنہ انجام کے لیے تیار رہو۔

ایلون مسک نے ایکس پلیٹ فارم پر جعلی خبروں اور پروفائلز کے خلاف لڑائی کے لیے جس کو رکھا ہے، وہ کوئی اور نہیں بلکہ سابق اسرائیلی جاسوس گائے ٹائٹلوچ ہے۔ ان کی ملاقات کا انتظام خود اسرائیلی وزیراعظم نے کیا۔ سوشل میڈیا پر چلنے والی ان مہمات کا ایک مقصد دنیا کی ہر برائی کی جڑ اسلام کو ثابت کرنا بھی ہے اور یہ صورتحال اتنی گھمبیر ہے کہ خود اسرائیلی کمپنی فیک رپورٹر (Fake Reporter) کے ملازم شائز کو پریشان کر دیا۔ ان کے مطابق:

اسلام کو دنیا کے سامنے ایک مسئلے کے طور پر پیش کرنا کوئی ایسا کام نہیں ہے جو ہماری ریاست کو کرنا چاہیے۔ یہ سب نفرت پھیلا رہا ہے، خوف پھیلا رہا ہے اور اس طرح کے پیغامات کو پھیلانا میرے لیے باعث شرمندگی ہے۔

آخر ایلون مسک کس کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے؟ غزہ جنگ شروع ہوتے ہی ایکس پلیٹ فارم کے بانی نے اسرائیل کا دورہ کیوں کیا؟ اور کیا اسرائیلی وزیراعظم اور ایلون مسک نے ایکس پلیٹ فارم پر اسرائیلی پروپیگنڈا پھیلانے اور یورپ اور امریکا میں فلسطینیوں سے بڑھتی ہوئی ہمدردی کو دبانے کے لیے سوشل میڈیا کی مدد سے مسلم عیسائی فسادات کا کوئی خفیہ منصوبہ بنایا ہے؟ شاید دنیا اس بارے میں کبھی نہ جان پائے۔

پاکستان: سوشل نیٹ ورکس کی تجربہ گاہ؟

پاکستان گزشتہ دس برسوں میں ان سوشل نیٹ ورکس کی محض ایک تجربہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ عوام کی اکثریت جو نہ لکھنا پڑھنا جانتی ہے اور نہ جہاں اخبار، ٹی وی اور دوسرے میڈیا تک عام رسائی تھی، اچانک اسمارٹ فون، انٹرنیٹ اور سوشل نیٹ ورکس کی دستیابی نے کیا گل کھلائے ہیں؟ کس طرح یہ پلیٹ فارمز ایک طرف تو سنسرشپ کے تحت مختلف نظریات کا گلا گھونٹتے رہے ہیں، تو دوسری طرف اپنے من پسند نظریات کی ترویج کرنے والوں کو لامحدود رسائی دی گئی ہے۔ نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ کہاں تو ریاست ففتھ جنریشن وارفیئر (Fifth Generation warfare) کے تحت اس سب کو پروان چڑھا رہی تھی، تو اب اس سب کو ڈیجیٹل دہشت گردی قرار دے کر مختلف فائر والز کے ذریعے روکنے کی کوشش کرتی نظر آ رہی ہے۔ کیا پانی سر سے گزر چکا ہے یا اس انتشار کو روکنے کی کوئی صورت ہے؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

کیا فائر وال مسئلہ حل کر پائے گی؟

تازہ خبروں کے مطابق حکومت پاکستان نے سوشل میڈیا کے شتر بے مہار پر قابو کرنے کے لیے دوبارہ فائر وال انسٹال کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے جو تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ اس سے قبل ۲۰۱۹ء میں بھی حکومت وقت نے ایک فائر وال انسٹال کر کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔

فائر وال انٹرنیٹ پر ٹریفک کو فلٹر کرنے کا کام کرتی ہے۔ اگر کسی ویب سائٹ کو بلاک کرنا ہو تو اس کا پتا یا URL فائر وال کو بتا دیا جاتا ہے اور پھر وہ ویب سائٹ اس ملک یا دفتر یا گھر جہاں بھی وہ فائر وال انسٹال ہو، کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ یہ کام تو تقریباً تمام ہی فائر والز کر لیتی ہیں۔ لیکن اگر کسی 'ایپلی کیشن' یا ویب سائٹ کو مکمل بند نہ کرنا ہو بلکہ ان پر موجود مخصوص مواد کو ہٹانا ہو، تو اب ایسی 'فائر والز' بھی آ گئی ہیں، جو ڈیپ پیکیٹ انسپکشن اور ایڈوانس ڈیپ پیکیٹ انسپکشن ٹیکنالوجی (Advanced Deep Packet Inspection) کا استعمال کرتے ہوئے کسی ایپ پر کال کو ریکارڈ کر لیتی ہیں، یا مخصوص مواد کو پڑھ کر اس مواد کو شیئر یا پھیلانے والے کا پتا لگا لیتی ہیں۔

اس قسم کی 'فائر والز' کا استعمال کوئی نئی بات نہیں ہے۔ چین نے اپنے عوام کا ڈیٹا محفوظ بنانے اور مغربی ممالک تک پہنچنے سے روکنے کے لیے نہ صرف فائر وال انسٹال کی ہوئی ہے، جسے 'گریٹ فائر وال آف چائنہ' کہا جاتا ہے، بلکہ تمام مغربی سوشل نیٹ ورکس پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔

یہ بات سمجھنے کے بعد یہاں پر بہت اہم سوال یہ ہے کہ کیا ایک ایسی دنیا میں جہاں یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ خدا اور کراماً کاتبین کے بعد آپ کو سب سے زیادہ یہ سوشل نیٹ ورکس جانتے ہیں، اور جہاں دنیا بھر میں موجود ہزاروں ڈیٹا سینٹرز پر دن رات چلنے والی بلا مبالغہ لاکھوں کروڑوں طاقتور مشینوں پر جمع ہونے والا یہ مواد یا ڈیٹا خدائی ذہانت یا Super Intelligence کے حصول کے لیے استعمال ہو رہا ہے، کیا ایک فائر وال انسٹال کر لینا کافی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ایک ایسی جنگ کا سامنا کر رہے ہیں جو ہم بغیر لڑے ہی ہار چکے ہیں؟

الحاد کا فروغ

جب ایک طرف تو مذہب کے ساتھ نفرت، دہشت، جنگ اور فساد کو جوڑ دیا جائے اور دوسری طرف مادیت کا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہو، تو اس کا لامحالہ نتیجہ خدا اور دین بیزاری کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہی کچھ امریکا میں ہوا جہاں نو گیارہ کے بعد اسلام کے خلاف مہم کا نتیجہ امریکی معاشرے میں الحاد یا Atheism کے دوبارہ عروج کی صورت میں نکلا ہے۔ لیکن سوشل میڈیا نیٹ ورکس نے اس صورتحال کو مہمیز دے کر پوری دنیا میں پھیلا دیا ہے۔ ماہرین کے مطابق دنیا بھر میں پھیلنے والی لادینیت یا الحاد کی بڑی وجہ سوشل میڈیا نیٹ ورکس ہیں۔ اس صورتحال پر برطانوی پروفیسر اسٹیفن بلیونٹ نے اپنی کتاب (غیر عیسائی امریکا کی تعمیر) یا Nonverts: The Making of Ex-Christian America میں روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کے خیال میں امریکا میں بڑھنے والے الحاد یا Atheism اور سیکولرازم کی سب سے بڑی وجہ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز ہیں:

کیونکہ لوگ عام زندگی کے مقابلے میں انٹرنیٹ پر مذہب اور سیاست کے بارے میں زیادہ بات کرتے ہیں، اس لیے یہاں ان کو مختلف نظریات کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا ہی کوئی نظریہ یا بات آپ کو اپنے اعتقادات کے بارے میں مختلف طریقے سے سوچنے پر مجبور کر سکتی ہے یا کم از کم آپ کو شک میں ضرور ڈال سکتی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ لوگ کتنا زیادہ وقت سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر صرف کر رہے ہیں، یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ بہت سے کمزور عقائد سے پیچھے ہٹنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ اور اگر اسی کے ساتھ دوسرے عوامل کو شامل کر لیا جائے تو اس سب سے (لوگوں کی) بڑی تعداد کو مذہب سے دور کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ یہاں تک کہ چند لوگ تو خدا پر یقین بھی کھو سکتے ہیں۔ گویا کہ کہاں تو سوشل میڈیا نیٹ ورکس ہم کو کنویں کا مینڈک بنا رہے تھے اور اب کہاں ہم خدا بیزار نسل کا ظہور انہی سوشل میڈیا نیٹ ورکس کی بدولت دیکھ رہے ہیں۔

سوشل میڈیا نیٹ ورکس اور دعوت کا میدان

سوشل میڈیا نیٹ ورکس اپنی دعوت کو پھیلانے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی بن کر سامنے آئے ہیں۔ کسی بھی موضوع پر فوری دستیاب معلومات کے حصول نے لوگوں کے لیے ایک دوسرے کو جاننے اور مختلف نظریات کو پڑھنے یا جاننے کا موقع بھی فراہم کیا ہے۔

گزشتہ دنوں امریکا میں ہونے والے الیکشن سے قبل ری پبلکن پارٹی کے قومی اجلاس میں سکھوں کی جانب سے نمائندگی کرنے والی ہرمیت ڈھلوں نے اپنی تقریر کا آغاز سکھوں کی دعا سے کر کے خبروں میں جگہ بنالی۔ تفصیلات کے مطابق سکھ ری پبلکن امیدوار کا سکھوں کے خدا 'واہ گرو' کا

ذکر امریکا میں موضوعِ بحث بن گیا۔ جہاں ان کے مخالفین نے اسے عیسائی دشمنی کہا تو ان کے حمایتیوں نے اسے دو مذاہب میں محبت بڑھانے کا ذریعہ۔ لیکن جو بات سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس تقریر کے بعد اگلے تین دنوں تک گوگل سرچ انجن پر امریکا میں سب سے زیادہ تلاش کیا جانے والا لفظ وہی 'واہ گرو' بن گیا اور گوگل ٹرینڈز کے مطابق گوگل استعمال کرنے والے ہر سو میں سے ستر افراد نے اگلے تین دنوں میں اس بارے میں جاننے کی کوشش کی۔

یہ واقعہ اسلام کی دعوت پھیلانے والوں کے لیے ایک امید اور دستیاب مواقع کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ کام انٹرنیٹ یا سوشل میڈیا نیٹ ورکس پر نہایت ہی غیر منظم انداز میں ہو رہا ہے۔ جہاں ایک طرف بعض لوگوں نے ان پلیٹ فارمز پر اسلام کے بجائے اپنے اپنے مسالک کا جھنڈا بلند کیا ہوا ہے، وہیں سنسرشپ بھی زبردست طریقے سے آڑے آرہی ہے۔ مثلاً جب ہم نے گوگل سرچ پر 'اللہ کون ہے؟' (Who is Allah)، 'اسلام میں خدا کا تصور' (God In Islam) اور 'محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ (Who is Muhammad?) تلاش کیا تو گوگل نے اپنے پہلے صفحے پر ہمیشہ وکی پیڈیا، برٹانیکا جیسی ویب سائٹس کو اوپر رکھا اور مسلمانوں کی بنائی کسی بھی اسلامی ویب سائٹ کو گوگل کے پہلے صفحے پر بمشکل ہی جگہ مل پائی۔

دوسری طرف اسلام، اللہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جڑے منفی سوالات کے لیے گوگل نے مغربی پروپیگنڈا ویب سائٹس کو پہلے صفحے پر پوری آزادی دی ہوئی ہے۔ یہ سوالات انگریزی زبان میں پوچھے گئے تھے لیکن دوسری زبانوں میں گوگل سرچ پر کیا صورتحال ہوگی، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس موضوع پر تفصیلی سوچ بچار کے بعد ایک جامع منصوبہ تشکیل دیا جائے اور اپنی دعوت کو مختلف زبانوں میں بہترین طریقے سے پیش کیا جائے۔ نبی مہربانؐ کی ذات کا نہ صرف دفاع کیا جائے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چہرہ دنیا کے سامنے لایا جائے۔ اسی طرح اسلام اور عیسائیت اور مسلم اور ہندو تصادم کی صورتحال کو بھی دوستانہ اور داعیانہ رخ دے کر نفرت کو محبت سے بدلا جائے۔

میٹاورس: سوشل میڈیا نیٹ ورکس کا مستقبل؟

'میٹاورس' ایک ایسی مصنوعی دنیا Virtual World کو کہتے ہیں، جہاں آپ کے بجائے آپ کا کارٹون کیریکٹر یا Digital Avatar آپ کی نمائندگی کرتا ہے۔ میٹاورس استعمال کرنے کے لیے آپ کو اپنی آنکھوں پر ایک ڈیجیٹل چشمہ یا Virtaul Reality Headset پہننا پڑتا ہے، جس کے بعد آپ ایک کثیر الجہتی ڈیجیٹل دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں جو حقیقی دنیا کا متبادل ہوگی۔ ابھی یہ ٹیکنالوجی اپنی ابتدائی شکل میں ہے لیکن 'میٹاورس' کو سوشل میڈیا نیٹ ورکس کا مستقبل کہا جاتا ہے جہاں دنیا بھر سے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر کاروبار سے لے کر تفریح تک سارے کام کریں گے۔

ماہرین کے خیال میں 'میٹاورس' کی ترقی سے ہم زندگی کے مختلف شعبہ جات میں اہم تبدیلیاں دیکھیں گے، مثلاً تعلیم، گھر بیٹھے کام کرنا، سیر و تفریح وغیرہ۔ مائیکروسوفٹ نے دفاتر کو ملازمین کے لیے مزید دلچسپ بنانے کے لیے اپنی مختلف ایپس میں 'میٹاورس' کو شامل کیا ہے تاکہ دو مختلف جگہوں پر بیٹھے لوگ زیادہ فعال طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ ملاقات کر سکیں۔ لیکن 'میٹاورس' کا سب سے زیادہ اثر آن لائن گیمنگ پر پڑ رہا ہے۔ اور میٹاورس نے ورچول رئیلیٹی (Virtual Reality) کی مدد سے آن لائن گیمنگ کو پہلے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے جو نوجوانوں کو ان پلیٹ فارمز پر زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے لیے ضروری ہے۔

اگر 'میٹاورس' قبولِ عام حاصل کر لیتا ہے، تو اس کے اثرات ناقابلِ بیان ہو سکتے ہیں۔ ہم نے اس مضمون کے آغاز میں جس واقعے کا ذکر کیا ہے، وہ پہلا نہیں ہے۔ ''انڈیپینڈنٹ'' اخبار کی ایک خبر کے مطابق نینا جین پٹیل، جو ایک ماہرِ نفسیات اور محقق ہیں، کو بھی اسی قسم کے تجربے سے گزرنا پڑا، جب وہ یہ معلوم کرنے کے لیے فیس بک کے میٹاورس پلیٹ فارم پر گئیں کہ وہ پلیٹ فارم خواتین یا بچوں کے لیے کتنا محفوظ ہے۔ ان کے مطابق محض ۶۰ سیکنڈ میں ہی ان کے کارٹون کردار کو بدترین ہراسگی کا سامنا کرنا پڑا، اور ان لوگوں یا کرداروں نے ان کے کردار کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی۔ یہ تجربہ ان کے لیے اس لیے بھی خوفناک ثابت ہوا کیونکہ انہوں نے 'ورچول ہیڈسیٹ' کے ساتھ ساتھ ہاتھوں اور کلائیوں میں بھی ایسے آلات (Touch controllers and wrist straps) پہن رکھے تھے، جن کی وجہ سے جب بھی میٹاورس میں ان کے کردار کو کوئی چھوتا تو اسے وہ اپنے جسم میں محسوس کر سکتی تھیں۔ 'فیس بک' کو اس خبر کے بعد اپنے میٹاورس پلیٹ فارم پر ذاتی حدود یا Personal boundries کا فیچر متعارف کرانا پڑا تاکہ دو کرداروں کے درمیان کم از کم چار فٹ کا فاصلہ رہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے لیے میٹاورس کیوں ضروری ہے؟ اس موضوع پر عالمی اقتصادی فورم کے مقرر اینڈریو راس سورکن (Andrew Ross Sorkin) روشنی ڈالتے ہیں:

ایک طرف امرا ہوں گے جو (حقیقی) سفر کیا کریں گے جو اس سفر کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں اور دوسری طرف عام لوگ جن کے وسائل کم ہیں۔ یہ لوگ اوکلس فیس بک کا ورچول رئیلیٹی ہیڈسیٹ (Facebook Virtual Reality headset) یا میجک لیپ یا کوئی اور دوسری مشین کا استعمال کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے صوفے پر بیٹھے سفر کیا کریں گے۔

اس سب کا نفسیاتی اثر کیا ہوگا؟ اس پر خود ہی روشنی ڈالتے ہوئے اینڈریو مزید کہتے ہیں:

لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر یہ سب (یعنی میٹاورس کا استعمال) ان دو طرح کے لوگوں کے درمیان ایک زیادہ وسیع نفسیاتی خلیج پیدا کرنے کا باعث بنے گا۔ اور میرے خیال میں ہم یہ سب سوشل میڈیا پر دیکھ چکے ہیں جہاں ایک طرف تو یہ (سوشل میڈیا) لوگوں کو کسی طرح قریب لانے کا باعث بنا ہے، تو دوسری طرف اس نے (لوگوں کے درمیان) ایک گہری خلیج پیدا کر دی ہے جو نہایت واضح ہے۔

صحت پر اثرات

شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ کون دن بھر ہیڈسیٹ پہنے اپنے صوفے پر بیٹھے زندگی بسر کرنا پسند کرے گا؟ لیکن پریشان کن صورتحال یہ ہے کہ کمپیوٹرز اور پھر اسمارٹ فونز کی ایجاد کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان کا استعمال دوسری چیزوں کے مقابلے میں خطرناک حد تک تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایک ریسرچ کے مطابق ۲۰ سال قبل دنیا بھر میں لوگ اوسطاً دو گھنٹے ان اسکرینز پر گزارتے تھے جو بڑھ کر آخری دس برسوں میں تقریباً پانچ گھنٹے اور اب تقریباً سات گھنٹے تک پہنچ گیا ہے۔ اور نوجوان نسل تقریباً ۹ گھنٹے اوسطاً روزانہ اپنے اسمارٹ فون پر گزارتی ہے۔

اس کا نتیجہ ہماری توجہ کے بٹ جانے کی صورت میں نکلا ہے۔ امریکی ادارہ برائے نفسیات کی ایک تحقیق کے مطابق ۲۰ سال قبل عام طور پر ایک شخص اوسطاً ڈھائی منٹ کسی بھی ایک کام پر توجہ مرکوز رکھتا تھا۔ ۲۰۱۳-۲۰۱۲ء میں توجہ کا دورانیہ (Attention span) گر کر ڈیڑھ منٹ تک رہ گیا تھا اور اب توجہ کا دورانیہ محض ۴۷ سیکنڈ رہ گیا ہے۔ اور اس میں بھی ۵۰ فیصد سے زیادہ لوگ کسی بھی کام پر ۴۰ سیکنڈ سے بھی کم توجہ مرکوز کر پاتے ہیں۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کی پروفیسر گلوریا مارک نے جو اس تحقیق کی سربراہ تھیں، ایک پوڈکاسٹ جس کا موضوع تھا کہ 'ہماری توجہ کا دورانیہ کیوں کم ہو رہا ہے؟' یا 'Why our attention spans are shrinking?' میں ان تفصیلات سے آگاہی دی۔ ان کے مطابق اس سب کا لازمی نتیجہ خرابیِ صحت کی

صورت میں نکلا ہے۔مثلاً بار بار ایک چیز سے دوسری چیز پر توجہ مرکوز کرنے سے تناؤ (Stress) اور بلند فشار خون کے مرض میں اضافہ ہوا ہے۔اسی طرح ہماری نیند کا دورانیہ بھی کم ہوگیا ہے۔

اس بڑھتے ہوئے 'اسکرین ٹائم' (Screen Time) کا سب سے خطرناک اثر بچوں پر پڑ رہا ہے۔جو بچے زیادہ وقت 'یوٹیوب' اور 'گیمنگ' پر صرف کرتے ہیں، ان کے دماغ کی بڑھوتری نہ صرف بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے بلکہ بڑھتی عمر کے ساتھ ان کے لیے یہ سب بالکل نارمل بن جاتا ہے۔اور ان کی اس خطرے سے نمٹنے کی صلاحیت اور خود پر قابو پانے کی صلاحیت غیرمحسوس طریقے سے کم ہوجاتی ہے۔اس صورتحال پر ایلون مسک نے والدین پر زور دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سوشل میڈیا کے زیادہ استعمال سے روکیں:

میں کہوں گا، (بلکہ) میں والدین پر زور دوں گا کہ وہ اپنے بچوں کے سوشل میڈیا پر صرف ہونے والے وقت کو محدود کریں کیونکہ وہ (بچے) ڈوپامین بڑھانے والی مصنوعی ذہانت کا شکار بن رہے ہیں۔

سوشل میڈیا کے بہتر استعمال کی تربیت

اس ضمن میں سب سے اہم کام جو والدین اور اساتذہ کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ خود کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو نہ صرف ان سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کے استعمال کے خطرات سے آگاہی دیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی آن لائن سماجی سرگرمیوں (Online Social activities) پر مختلف ایپس کی مدد سے نظر بھی رکھیں۔

اس کام کو صرف انفرادی سطح پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر کرنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ نئی نسل کے دین، ایمان ہی نہیں بلکہ ان کی ذہنی اور جسمانی صحت کو بھی محفوظ بنایا جاسکے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ ریاست کی بھی ذمہ داری ہے کہ جدید 'فائر والز' کو صرف اپنے خلاف ہونے والے پروپیگنڈا کو روکنے کے لیے ہی استعمال نہ کرے، بلکہ اس کے ساتھ سوشل نیٹ ورکس پر پھیلی فحاشی، لادینی نظریات اور اخلاق باختہ خیالات کو روکنے کے لیے بھی استعمال کرے۔صورتحال کی سنگینی پر مشہور اسرائیلی دانشور نوح ہریری نے کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے:

میں اپنے دماغ کا اچھا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ہمارے دماغ پتھر کے زمانے کے بنے ہوئے ہیں جب (آج کل کے مقابلے میں) بالکل الگ ماحول تھا۔آج ہمیں معلومات کے ایک سیلاب کا سامنا ہے جس سے نبردآزما ہونا ہمارے بس کی بات نہیں۔دنیا کے ذہین ترین افراد پچھلے کئی برسوں سے ان مشینوں کو ہمارے دماغوں کو قابو کرنے اور ہمارے جذبات سے کھیلنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور جو کوئی بھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس صورتحال کا مقابلہ کرسکتا ہے، اپنے آپ کو بے وقوف بنا رہا ہے۔یہ سب ہم سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔میں یہ نہیں کہتا کہ ہم اس (ڈیجیٹل) دنیا سے بالکل الگ ہوجائیں لیکن کچھ دیر کے لیے اس سے دُور رہنا تاکہ ہم اپنے دماغ کو ان مضر اثرات سے دُور کریں ضروری ہے۔ساتھ ہی ہم کو اس (بے ہنگم اور بے تحاشا) معلومات سے پرہیز بھی کرنا ہوگا۔

خلاصۂ بحث

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ کو عوام کو قابو کرنے کا ایک انوکھا طریقہ سوجھا۔اس نے تجربے کے لیے چند بچوں کو ایک اندھیرے غار میں قید کردیا، جہاں روشنی کا کوئی گزر نہ تھا۔غار کے بیچ میں آگ جلتی رہتی تھی اور غار کے داخلے کی جگہ پر چند غلام کھڑے پتلی تماشا دکھایا کرتے تھے جس کا عکس غار کی دیوار پر پڑتا تھا۔وہ بچے جو اس غار میں قید تھے، ان کی دنیا اور سمجھ بوجھ بس یہی غار اور اس میں دکھایا جانے والا وہ پتلی تماشا تھا جس کا عکس وہ غار کی دیوار پر دیکھا کرتے تھے۔آخر ایک بچے نے ہمت کی اور اس غار سے نکلنے کی کوشش کی لیکن غار سے باہر نکلتے ہی سورج کی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ غار میں واپس آگیا۔اس کے تجربے کو دیکھتے ہوئے دوبارہ کسی نے اس غار سے نکلنے اور حقیقت پانے کی کوشش نہیں کی۔

افلاطون (م: ۳۴۰ ق م) نے یہ تمثیل اپنی کتاب ریاست (Repulic) میں کوئی دوہزار سال قبل بیان کی تھی۔لیکن اب جدید دنیا کے فلسفی سوشل میڈیا اور اس کے اثرات کو اسی تمثیل کے ذریعے بیان کرتے نظر آتے ہیں۔

جس اطلاعاتی دور (Information Age) کے خطرات پر کچھ عرصہ قبل محض گفتگو ہوتی تھی، وہ دور آج ہمارے سامنے ایسی آب و تاب سے آن کھڑا ہے کہ اس نے دیکھنے والی آنکھوں کو خیرہ اور سوچنے والے ذہنوں کو ماؤف کردیا ہے۔مدہوشی کی ایک کیفیت ہے جو پوری انسانیت پر طاری ہے۔ایک طرف راتوں رات مشہور اور جلد از جلد امیر بننے کی خواہش نے فرد، خاندان اور معاشرے کو بری طرح تقسیم کردیا ہے، تو دوسری طرف بڑھتی ہوئی لادینیت کا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔نہ اس سب سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر آتا ہے اور نہ کوئی راہ فرار۔المیہ یہ ہے کہ جس اُمت کو 'اُمت وسط' کا کردار ادا کرنا تھا اور جس نے دنیا کو خبردار کرنا تھا، وہ بے بسی سے اسی سیلاب میں بہتی نظر آرہی ہے۔

(بحوالہ: ماہنامہ 'عالمی ترجمان القرآن' لاہور۔اکتوبر ۲۰۲۴ء)

بقیہ: فلسطین کا بڑا قیدی

اگر مروان فلسطینیوں کو مایوس نہ بھی کرے تو وہ مروان کو مایوس کرسکتے ہیں۔یہ واضح نہیں کہ اگر مروان نے لوگوں سے مقبوضہ بیت المقدس کی طرف مارچ کرنے کو کہا تو اُن کا ردِعمل کیا ہوگا۔غزہ میں اسرائیلی فوج نے جتنے بڑے پیمانے پر ہلاکتوں کا بازار گرم کیا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے اب ایسے کسی مارچ کی گنجائش کم دکھائی دیتی ہے۔

مقبولیت کے باوجود مروان کو ایک بنیاد کی ضرورت تو ہے۔تنظیمی ڈھانچے پر محمود عباس کے ساتھیوں کا کنٹرول ہے۔اس وقت مروان کے پاس کوئی بھی تنظیمی ڈھانچا نہیں۔

سابق اسرائیلی وزیر ہائم اورون کہتے ہیں کہ مروان مذاکرات میں ہمارے پارٹنر رہیں گے۔وہ نیلسن مینڈیلا تو نہیں ہیں مگر خیر، وہ مروان تو ہیں۔ہائم اورون کا کہنا ہے کہ مروان نے مجھ سے فلسطینیوں کے حقوق کی بات کی اور جب میں نے یہودیوں کے حقوق کی بات کی تو اُنہوں نے سُنی بھی اور سمجھی بھی۔

مروان کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ وہ منتقم مزاج نہیں۔اور نفرت کو پروان چڑھانے کے حق میں بھی نہیں۔برسوں کی لڑائی اور ہلاکتوں کے باعث وہ بھی اب لڑائی سے بیزار دکھائی دیتے ہیں۔وہ بظاہر اس بات کے حق میں دکھائی دیتے ہیں کہ روئے ارض کے اس ٹکڑے پر یہودی اور فلسطینی کسی نہ کسی طور مل کر رہیں، ایک دوسرے کو قبول کریں۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Marwan Barghouti, the world's most important prisoner". ("The Economist". July 22, 2024)

برصغیر پاک و ہند کا معروف علمی و تحقیقی رسالہ

سہ ماہی ''تحقیقاتِ اسلامی'' علی گڑھ (بھارت)

اب پاکستان میں دستیاب ہے

زرِتعاون فی شمارہ:

۴۰۰ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

تازہ شمارہ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۴ء) حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

اسلامک ریسرچ اکیڈمی

ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا۔کراچی

فون: ۰۲۱۔۳۶۳۶۸۰۲۰، ۰۳۳۴۔۳۹۱۲۷۶۹

انتخابات کا سال: جمہوریت کا امتحان

جب امریکی عوام اگلے ماہ صدارتی انتخابات میں ووٹ ڈالیں گے تو جمہوریت کو ایک اہم امتحان کا سامنا ہوگا۔ رواں سال جمہوریت کو غیر معمولی دباؤ کا سامنا رہا ہے اور امریکا میں ہونے والے انتخابات دنیا بھر میں جمہوریت کی صورتحال پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ اگر نتائج بدنظمی یا تشدد کی نذر ہوتے ہیں تو دنیا بھر میں آمر حکمرانوں کو تقویت ملے گی اور عوام کی حکمرانی کے نظریے پر اعتماد کو ٹھیس پہنچے گی۔ لیکن اگر انتخابی عمل شفاف رہا اور ہارنے والے امیدوار نے وقار کے ساتھ اپنی شکست تسلیم کی تو ان ممالک میں جمہوریت کے لیے اُمید پیدا ہوگی جہاں انتخابی عمل بحالی کی طرف گامزن ہے۔

اس سال اب تک ۷۶ ممالک میں انتخابات ہو چکے ہیں، جن کی مجموعی آبادی ۴ء۳ ارب کے قریب ہے۔ مزید ۴۴ کروڑ ۲۰۲۴ء کے اختتام سے پہلے اپنا حق رائے دہی استعمال کریں گے۔ رواں سال کے آغاز میں، ''دی اکانومسٹ'' نے خبردار کیا تھا کہ اس سال ہونے والے انتخابات ایک زبردست اعصابی امتحان ہوسکتے ہیں۔ گزشتہ ۱۸ برسوں میں ووٹنگ، میڈیا کی آزادی اور اقلیتوں پر جبر جیسے معاملات میں خراب کارکردگی دکھانے والے ممالک کی تعداد بڑھی ہے۔ رواں سال ووٹ ڈالنے والوں میں سے ہر تیسرے شخص کا تعلق ایسے ملک سے ہے جہاں گزشتہ ۵ برسوں میں انتخابات کا معیار گر چکا ہے۔

اب جبکہ دنیا بھر میں ۹۰ فیصد سے زیادہ ووٹ ڈالے جاچکے ہیں، یہ واضح ہوتا جارہا ہے کہ جمہوریت کچھ ممالک میں مضبوط ہوئی ہے۔ ۴۲ ممالک میں انتخابات آزادانہ اور شفاف رہے، ووٹر ٹرن آؤٹ بہتر رہا، انتخابی دھاندلی محدود رہی اور تشدد میں بھی کمی آئی۔ تاہم نئے خطرات بھی سامنے آئے ہیں جیسے کہ ٹیکنالوجی کے ماہر نئے آمر حکمران، ووٹروں کی تقسیم اور وہ سابق رہنما جو اقتدار چھوڑنے کے باوجود اپنے جانشین حکمرانوں پر اثر انداز ہونا چاہتے ہیں۔

پہلا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ دو دہائیوں میں پہلی بار ووٹر ٹرن آؤٹ بڑھا ہے جو اس بات کی نشانی ہے کہ عوام سیاسی عمل میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ مستحکم جمہوریتوں میں ووٹر ٹرن آؤٹ مستحکم رہا، جبکہ ایسے ممالک جہاں جمہوریت ابھی مستحکم نہیں ہے، ان میں بھی ٹرن آؤٹ میں تین فیصد اضافے کے ساتھ نمایاں بہتری آئی ہے۔ فرانس، انڈونیشیا، جنوبی کوریا اور میکسیکو سمیت کئی ممالک میں ٹرن آؤٹ میں اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ یورپی پارلیمانی انتخابات، جو اکثر بہت بیزار کرنے والے سمجھے جاتے ہیں، میں بھی ۲۰۰۴ء کے بعد سب سے زیادہ ووٹر ٹرن آؤٹ دیکھنے کو ملا۔

دوسری مثبت بات یہ ہے کہ انتخابات کو نقصان پہنچانے کی کوششیں زیادہ کامیاب نہیں ہوئیں۔ کئی ماہرین کو خدشہ تھا کہ سوشل میڈیا اور مصنوعی ذہانت کے ذریعے غلط معلومات پھیلائی جائیں گی، لیکن یہ خطرہ اتنا بڑا ثابت نہیں ہوا۔ تائیوان میں ووٹروں نے چینی دباؤ کے باوجود ولیم لائی چنگ تے کو صدر منتخب کیا۔ مالڈووا نے روسی مداخلت کے خلاف کامیابی سے اقدامات کیے اور ۱۵ ملین ڈالر کی رشوت کے منصوبے کو بے نقاب کیا۔ سینیگال میں عدالتوں نے ایک مضبوط حکمران کے غیر معینہ مدت تک حکومت کرنے کے خواب کو ناکام بنایا اور عوام نے باسرو دیومی فائے کو جمہوری طریقے سے منتخب افریقا کا سب سے کم عمر رہنما بنایا۔

تیسری امید افزا بات یہ ہے کہ ووٹروں نے حکمرانوں کو ان کے اقدامات کے حوالے سے جوابدہ بنایا۔ اس سال ہونے والے جمہوری انتخابات میں نصف سے زائد میں ووٹروں نے حکومتی جماعتوں کو شکست دی یا ان کی پارلیمانی اکثریت ختم کر دی۔ برطانیہ میں لیبر پارٹی نے ۱۹۹۷ء کے بعد سب سے بڑی پارلیمانی فتح حاصل کی، جبکہ جنوبی کوریا میں پیپلز پاور پارٹی کو بدعنوانی کے الزامات کے باعث اپریل میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

معاشی اعتبار سے ابھرتے ہوئے جمہوری ممالک میں بھی عوام نے حکمرانوں کو سخت پیغام دیا۔ جنوبی افریقا میں عوام نے بدعنوانی اور نااہلی سے تنگ آکر حکمران جماعت اے این سی سے اکثریتی نشستیں چھین لیں، جس کے نتیجے میں پارٹی کو پہلی بار مخلوط حکومت بنانی پڑی۔ بھارت میں نریندر مودی کی حکومت کو جون میں پارلیمانی اکثریت کھونی پڑی حالانکہ وہ ہندو قوم پرستی کو ہوا دے رہے تھے اور ان کے پاس میڈیا کی حمایت بھی تھی۔ ترکی کے صدر رجب طیب اردوان کو مارچ میں بڑے شہروں میں اپنی پارٹی کی شکست برداشت کرنی پڑی۔

جمہوریت کے یہ مثبت پہلو اپنی جگہ، مگر کچھ پرانے اور نئے خطرات بھی موجود ہیں۔ کچھ ممالک میں آمر حکمرانوں نے انتخابات کو معطل یا دھاندلی زدہ کر دیا۔ برکینا فاسو اور مالی میں فوجی حکمرانوں نے انتخابات اور اقتدار کے سویلین حکومت کو منتقل کیے جانے کے عمل کو غیر معینہ مدت تک ملتوی کر دیا۔ روس میں ولادیمیر پیوٹن نے ایک ایسے الیکشن میں ۸۸ فیصد ووٹ حاصل کیے جو شفاف نہیں تھے اور انتخابات سے قبل ان کے سب سے بڑے سیاسی حریف الیکسی ناوالنی کی جیل میں موت کو ایک 'بدقسمت واقعہ' قرار دیا گیا۔

رواں سال کئی جگہوں پر انتخابات محض دکھاوے کی حد تک رہے۔ روانڈا میں پال کاگامے نے ۹۹ فیصد ووٹوں کے ساتھ انتخاب جیتا، جو دھاندلی کی واضح مثال تھی۔ الجزائر میں عبدالمجید تبون نے ۹۵ فیصد ووٹ جیتنے کے بعد خود بھی حیرت کا اظہار کیا اور انتخابی اتھارٹی پر نتائج میں 'غلطیوں اور تضادات' کا الزام لگایا۔ وینزویلا میں نکولس مادورو نے نتائج میں مبینہ ہیرا پھیری کے بعد اپنے مخالف کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن آمرانہ نظام رکھنے والے ایسے ممالک میں بھی ووٹر ٹرن آؤٹ میں اضافہ ہوا۔ تاہم جہاں آمرانہ اور جمہوری نظام کی کوئی ملی جلی شکل نافذ ہے، وہاں ٹرن آؤٹ میں اوسطاً چار فیصد کمی ہوئی، جو عوام میں مایوسی کی علامت ہے۔ بنگلا دیش میں محض ۴۲ فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالا، جو شیخ حسینہ کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار تھا، بعد ازاں انہیں اگست میں بڑے احتجاج کے بعد ملک چھوڑنا پڑا۔

دوسری جانب کچھ سابق حکمران اقتدار چھوڑنے کے بعد بھی اپنا اثر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ انڈونیشیا میں جوکو ویدودو (جو اکتوبر میں اقتدار چھوڑنے والے ہیں) اقتدار چھوڑنے کے باوجود اپنی طاقت برقرار رکھنے کے لیے اپنے بیٹے کو نائب صدر منتخب کروانے میں کامیاب ہوئے اور سیاسی جماعتوں پر بھی اپنا اثر قائم رکھا۔ میکسیکو میں آندریس مینوئل لوپیز اوبراڈور کی جانشین کلاؤڈیا شین بام کی جیت کے باوجود، عوام کو خدشہ ہے کہ سابق صدر پس پردہ رہ کر حکومت پر اثر انداز ہوں گے۔

جمہوریت کو ایک نیا خطرہ جدید آمر حکمرانوں سے ہے جو سوشل میڈیا کا استعمال کرتے ہوئے عوام کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔ ایل سلواڈور کے نایب بوکیلے نے سوشل میڈیا اور بڑے پیمانے پر جرائم پیشہ افراد کی گرفتاریوں سے حاصل ہونے والی مقبولیت کے ذریعے ۸۵ فیصد ووٹ حاصل کیے۔ انہوں نے آئین کو توڑا اور عدلیہ کو اپنے تابع کر لیا۔

یورپ میں سیاسی جماعتوں اور ووٹنگ کے رجحانات میں تقسیم ایک اور بڑھتا ہوا مسئلہ ہے۔ جرمنی میں حکمران اتحاد

باقی صفحہ نمبر ۲

بنگلادیش: پراکسی نہیں، فوج

آصف محمود

''بنگلا دیش کی سیاست میں فاشسٹ حسینہ واجد اور اس کی فاشسٹ عوامی لیگ کے لیے فی الحال کوئی گنجائش نہیں''۔ یہ ڈھاکا کے کسی جذباتی نوجوان کا موقف نہیں، یہ بنگلا دیش کی عبوری حکومت کے سربراہ محمد یونس کا بیان ہے جن کی عمر ۸۴ سال ہے۔

''فنانشل ٹائمز'' میں شائع ہونے والے اس بیان میں غور وفکر کا بہت سارا سامان موجود ہے۔ اس بیان کے متن میں کچھ نیا نہیں۔ ایسے بیان ہم یہاں روز پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اہم یہ ہے کہ بیان دینے والا کوئی جواں سال جذباتی کارکن نہیں، نہ ہی وہ حسینہ واجد کا سیاسی مخالف ہے۔

یہ ایک ایسے آدمی کا بیان ہے جو نوبل انعام یافتہ ہے۔ بھرپور شناخت رکھتا ہے اور اسے معلوم ہے وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس بیان کی شرح بھی محمد یونس نے خود ہی بیان کر دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حسینہ واجد اور ان کی پارٹی فاشسٹ ہے۔ انہوں نے اپنے جبر سے لوگوں کو قابو کر کے رکھا ہوا تھا، ساری سیاسی مشینری ان کے قبضے میں تھی، انہوں نے ریاستی اداروں کو اپنے شکنجے میں لے کر اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا۔ یہ جو آخری نکتہ ہے، یہ زیادہ قابل غور ہے۔

سیاست کی حد تک حسینہ واجد کا فاشزم سامنے کی حقیقت ہے لیکن اس کا کیا مطلب ہے کہ ''انہوں نے ریاستی اداروں کو اپنے شکنجے میں لے کر اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا''؟ اس کا آسان سا مطلب یہ ہے کہ چونکہ حسینہ واجد کی سرپرستی بھارت کر رہا تھا اس لیے حسینہ واجد نے فوج کو بھی بھارتی پراکسی بنا دیا اور فوج کے اعلی افسران بنگلا دیش کے بجائے بھارتی مفادات کے لیے کام کرنے لگے۔ یہ کوئی اندازہ یا تجزیہ نہیں ہے، یہ حقیقت ہے اور بنگلا دیش کے اخبارات اس حقیقت کے ابلاغ سے بھرے پڑے ہیں۔ حال ہی میں بنگلا دیش کے تین جرنیلوں کو فوج سے نکال دیا گیا ہے۔ ایک لیفٹیننٹ جنرل مجیب الرحمٰن کو تو فارغ کر دیا گیا ہے۔ دوسرے لیفٹیننٹ جنرل سیف العالم، انہیں جبری ریٹائر کر دیا گیا ہے۔ نہ صرف انہیں جبری ریٹائر کیا گیا ہے بلکہ ان کے اکاؤنٹس بھی منجمد کر دیے گئے ہیں اور صرف ان ہی کے نہیں ان کے بچوں کے اکاؤنٹ بھی منجمد کر دیے گئے ہیں۔ تاکہ بھارتی سرکار کی پراکسی کا کردار ادا کرنے کی بدولت جو کچھ انہوں نے ہتھیایا ہے، فی الوقت اسے استعمال نہ کر سکیں۔ تیسرے میجر جنرل حامد الحق، انہیں بھی جبری ریٹائر کر کے گھر بھیج دیا گیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تینوں افسران ڈائریکٹوریٹ جنرل آف فورسز انٹیلی جنس کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بنگلا دیش کے عسکری معاملات میں بھارت کس حد تک دخیل ہو چکا تھا۔ جنرل مجیب الرحمٰن کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ قتل و غارت کا جو کھیل مکتی باہنی نے شروع کیا، اُس کو اب سرکاری سرپرستی میں جنرل مجیب چلا رہا تھا۔ فاشسٹ طرزِ حکومت میں یہ اصول طے ہو چکا تھا کہ جو عوامی لیگ کا دشمن ہے، وہ بھارت کا دشمن ہے اور جو بھارت کا دشمن ہے، وہ عوامی لیگ کا دشمن ہے۔

عوامی لیگ چونکہ بھارتی پراکسی کا کردار ادا کرتی رہی، اس لیے بھارت اس کے سیاسی مخالفین کو اپنا دشمن سمجھتا رہا، ان مخالفین کا دونوں مل جل کر قتل عام کرتے رہے۔ کسی کو عدالتی ٹربیونل کے ذریعے مار دیا گیا اور کئی جنرل مجیب کے نیٹ ورک کے ہاتھوں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

چٹاگانگ کے سفیان صدیقی کی تازہ رپورٹ کے مطابق یہ تین دائروں میں ہونے والی دہشت گردی تھی۔ انتظامی، عدالتی اور بھارتی۔ یہ معاملات اتنے بگڑ چکے تھے کہ بنگلا دیش کی سیکیورٹی کے تقاضے کمپرومائز ہو رہے تھے۔ جرنیل بنگلا دیش کے تھے، لیکن کام بھارت کے لیے کر رہے تھے۔

ہر وہ تزویراتی منصوبہ ناکام بنا دیا جاتا اور ہر وہ تجویز رد کر دی جاتی، جس سے بھارت کے مفاد کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا۔ اپنے اقتدار کے لیے بنگلا دیشی فوج میں بھارتی اثر و رسوخ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اب جب بدلتے حالات میں جنرل مجیب بھاگ کر بھارت گئے تو یہ سارے قصے منظر عام پر آ گئے۔ یہ جنرل مجیب ہی تھے جنہوں نے براہ راست 'را' کے نیٹ ورک کو بنگلا دیش میں اپنی چھتری تلے کام کرنے کی اجازت دی۔ جنرل مجیب ہی نے ان کو آخری دنوں میں بنگلا دیش سے بحفاظت بھارت پہنچانے کے انتظامات کیے۔ اخباری خبروں کے مطابق 'را' کے ان کارندوں کی تعداد دو سو سے زیادہ تھی جنہیں بنگلا دیش سے بحفاظت بھارت پہنچایا گیا۔

''ڈھاکا ٹربیون'' کے مطابق ان پر کم از کم چار سو بنگالی شہریوں کے قتل کا الزام ہے۔ یہ اتنے طاقتور تھے کہ حسینہ واجد کی سرپرستی میں کوئی قانون ان پر گرفت نہ کر سکا۔ انہوں نے ریاست کے اندر ریاست بنا رکھی تھی، جو بھارتی ایجنسی 'را' کی براہ راست نگرانی میں کام کر رہی تھی۔ اس نیٹ ورک میں شامل تقریباً نصف درجن جرنیلوں کے نام ان دنوں بنگلا دیش کے اخبارات میں نمایاں ہیں، جو تھے تو بنگلا فوج کے لیکن اُن کی وفاداریاں بھارت کے ساتھ تھیں۔ جنرل ضیاء الاحسن، جنرل تبریز، جنرل صالح، جنرل اکبر۔۔۔ ایک طویل فہرست ہے جو حقیقتِ حال کا پتا دیتی ہے۔

چنانچہ جب حال ہی میں ''مکتی جودھا''، یعنی مکتی باہنی کے دہشت گردوں کی اولاد کے لیے تیس فیصد کوٹے کے خلاف تحریک چلی تو اسے کچلنے کے لیے بنگلا دیش کے فوجی افسران تیار نہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ اعلیٰ افسران بھارتی پراکسی کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس دفعہ، یوں سمجھئے کہ بنگلا دیشی فوج میں ایسے عناصر غالب تھے جنہوں نے واضح پیغام دے دیا تھا کہ اب بھارتی پراکسی بننے کی گنجائش نہیں ہے۔

اس واضح پیغام کے بعد ہی حسینہ واجد بھارت بھاگیں، ورنہ ان کا خیال یہی تھا کہ جس طرح بھارتی فوجی دستے منگوا کر انہوں نے ۲۰۰۹ء کی بغاوت کو کچل دیا تھا، اسی طرح وہ حالیہ تحریک کو بھی کچل دیں گی۔ لیکن اب ۲۰۰۹ نہیں تھا۔ وہی کام دوسری بار نہ ہو سکا کیونکہ اس دفعہ بنگلا دیشی فوج کے اندر بھارت کی پراکسی کا کردار ادا کرنے والے جرنیلوں کے خلاف لاوا پک چکا تھا۔ چنانچہ حسینہ واجد بھاگیں اور ساتھ ہی ان کا بھارت نواز جرنیل مجیب الرحمٰن بھی بھاگا۔

یہ بھارت نواز پالیسیوں کے خلاف ویسا ہی ردعمل تھا جیسا شیخ مجیب کی بھارت نوازی کے خلاف ہوا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اب کی بار ردعمل کا رنگ جمہوری تھا اور اسی وجہ سے حسینہ واجد جان بچانے میں کامیاب ہو سکیں۔ بنگلا دیش کی حکومت کے سامنے اس وقت بہت بڑا چیلنج یہی ہے کہ اپنی فوج میں سے بھارت کے لیے کام کرنے والے عناصر کو بے نقاب کر کے الگ کیا جائے۔ یہ کام آسان نہیں مگر ناگزیر ہے۔ بنگلا دیش مزید بھارتی پراکسی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

(بحوالہ: ''روزنامہ ۹۲ نیوز ڈاٹ کام'')